A Sketch Of Anthropology And Psycholgy

The Mirror of Man

MIRAT-UL-INSAN

Rev. Mawlawi Dr. Imad ud-din Lahiz

مرآۃ الانسان

علامہ عماد الدین لاہز

www.noor-e-hayat.com

Rev. Mawlawi Dr.Imad ud-din Lahiz

1830–1900

پادری مولوی عماد الدین لاہز

Mirta-ul-Insan

The Mirror of Man

The Sketch of Anthropology and Psychology

By

Rev. Mawlawi Dr.Imad ud-din Lahiz

The wisdom of the prudent is to give thought to their ways
Proverbs 14:8

دانا انسان کی حکمت یہ ہے کہ اپنی راہ پہچانے
(کتاب مقدس۔امثال ۱۴:۸)

مراۃ الانسان

یہ کتاب انسانی کیفیت وغیرہ کے بارے میں

پادری مولوی عماد الدین لاہز۔ڈی۔ڈی

نے اس مراد سے لکھی کہ اس کے پڑھنے والے خودشناسی میں
ماہر ہو کے خداشناسی کی دولت تک رسائی حاصل کریں اور

۱۸۸۹ء
مطبع ریاض ہند امرتسر میں چھپی

فہرستِ مضامین مراۃ الانسان

دیباچہ

دفعہ ۱	خداشناسی کا بیان	۸
دفعہ ۲	ماخذ خیالات کتاب ہذا کا ذکر	۹
دفعہ ۳	ایمان کا بیان	۱۱
دفعہ ۴	خدا تعالیٰ جاشانہ کا ذکر	۱۲
دفعہ ۵	لفظ انسان کا بیان	۱۴
دفعہ ۶	لفظ آدم کا بیان	۱۴
دفعہ ۷	لفظ حوا کا بیان	۱۵
دفعہ ۸	وحدت ابوی کا بیان	۱۵
دفعہ ۹	انسان ایک خاص وقت سے دنیا میں ہے	۱۶
دفعہ ۱۰	آدم کیونکر پیدا ہوا	۱۷
دفعہ ۱۱	ہم سب کیونکر پیدا ہوتے ہیں	۱۹
دفعہ ۱۲	انسان کی اصطلاحی تعریف	۳۱
دفعہ ۱۳	نطق کے بیان میں	۲۳
دفعہ ۱۴	جان اور روح کا بیان	۲۴
دفعہ ۱۵	روح اور جان کی زیادہ توضیح	۲۵

دفعہ۔ ۱۶	نفس ناطقہ میں کچھ علوی کرنیں چمکتی ہیں	۲۶
دفعہ۔ ۱۷	فائدہ یادرکھنے کی لائق	۲۸
دفعہ۔ ۱۸	انسانی حواس عشرہ کا بیان	۲۹
دفعہ۔ ۱۹	انسان کے دل کا بیان	۳۴
دفعہ۔ ۲۰	دماغ جگر گردوں اور انتڑیوں کا بیان	۳۵
دفعہ۔ ۲۱	غم کا بیان	۳۶
دفعہ۔ ۲۲	خوشی کا بیان	۳۸
دفعہ۔ ۲۳	جسم کے بدکاموں کا بیان	۴۳
دفعہ۔ ۲۴	انسانی جسم کے ناموں کا بیان	۴۳
دفعہ۔ ۲۵	روح انسانی کی صفات کا بیان	۴۴
دفعہ۔ ۲۶	روح انسانی غیر فانی ہے	۴۴
دفعہ۔ ۲۷	انسانی روح مجبور نہیں آزاد ہے	۴۵
دفعہ۔ ۲۸	روح انسانی میں دو طرفہ توج ہے	۴۵
دفعہ۔ ۲۹	روح جب گناہ میں ہے مردہ ہے مسیح اسے زندہ کرتا ہے	۴۶
دفعہ۔ ۳۰	روح پر اندھیرا سا ہے جسکے چار مخرج ہیں	۴۷
دفعہ۔ ۳۱	خدا ہمارا نشانہ ہے	۴۸
دفعہ۔ ۳۲	نیند اور غنودگی کا بیان	۴۹
دفعہ۔ ۳۳	خواب کا بیان	۴۹

دفعہ ۳۴	پیغمبروں اور مومنین کی خواب کا بیان	۵۱
دفعہ ۳۵	اطوار تعلیم و تعلم	۵۱
دفعہ ۳۶	اطوار تحقیقات کا بیان	۵۳
دفعہ ۳۷	کامل انسان کا بیان	۵۵
دفعہ ۳۸	انسان کے پیدا کرنے سے خدا کا کیا مطلب ہے	۵۷
دفعہ ۳۹	موت کا بیان	۶۰
دفعہ ۴۰	تعلقات ارواح مومنین باخداوند یسوع	۶۳
دفعہ ۴۱	روح انسانی کے لباس کا بیان	۶۵

دیباچہ

حق تعالےٰ جل شانہ کی حمد وثنا کے بعد بندہ **عماد الدین لاہز** ناظرین کتاب ہذا کی خدمت میں یوں عرض کرتا ہے کہ اب تک مجھے کوئی ایسا رسالہ نظر نہ آیا جس میں انسان کا ضروری بیان کچھ تو ہو جس کے وسیلہ سے عوام الناس اپنی روح کی کیفیت سے اور اپنی اندرونی حالت سے کسی قدر آگاہی حاصل کریں۔ یہ میں جانتا ہوں کہ میں اس لائق نہیں ہوں کہ یہ بھاری کام کر سکوں اور اس بحث کے تمام پہلو جیسے چاہئے ویسے دکھلاؤں .تو بھی میں نے ارادہ کیا کہ خُدا سے دعا مانگ کے جو کچھ لکھ سکتا ہوں لکھوں اور دوسرے ذی علم لائق آدمیوں کو جو مجھ سے بہتر کام کر سکتے ہیں اُبھاروں کہ وہ اس مہم کی طرف متوجہ ہوں اور یہ میرا رسالہ خود شناسی کے بارے میں ایک ابتدائی کتاب ہو جائے۔ پس میں نے یہ رسالہ لکھ دیا اور اس کا نام **"مِراۃ الانسان"** رکھا۔

"مراِۃ" کے معنی ہیں **"شیشہ"**۔ وہ سب شیشے جو لوگوں کے گھروں میں ہیں اُن میں وہ اپنی ظاہری صورت کو دیکھ کے درست کیا کرتے ہیں تاکہ وہ اچھے معلوم ہوں۔ یہ کتابی شیشہ ہے۔ چاہئے کہ وہ اس میں اپنی اندرونی اور پوشیدہ کیفیت وحالت کو فکر کی آنکھ سے دیکھیں اور اپنی اصلاح کے درپے ہوں تاکہ خُدا کو پسند آئیں جس کی نگاہ انسان کے دل پر ہے۔

دفعہ ا

خود شناسی کے بیان میں

عربی زبان میں ایک قدیم کہاوت ہے اور اہل تصوف اُس کا استعمال بہت کرتے ہیں اور وہ صحیح کہاوت ہے جو یہ ہے **(مَن عرف نفسه فقد عرف ربهٗ)** یعنی **" جس نے اپنے آپ کو پہچانا اُس نے اپنے رب کو پہچانا"**۔ "رب" کے معنی ہیں " پرورش کنندہ"۔ "ربیب" کے معنی ہیں " پرورش یافتہ"۔ ہم سب ربیب ہیں ہمارا کوئی رب ہے اُسی کا دوسرا نام خُدا تعالیٰ ہے اور ربوبیت وہ کام ہے جو رب اور ربیب کے درمیان رب سے ہوتا ہے۔

اگر آدمی اپنے آپ کو پہچانیں کہ ہم کون ہیں ؟اور کس حال میں ہیں؟ تو اس شناخت کے وسیلہ سے خُدا کی شناخت کہ وہ کون ہے؟ اور کیسا ہے ؟آسان ہو جاتی ہے۔ رب کی شناخت سے مراد یہ ہے کہ اُس کی کچھ شان اور مرضی معلوم ہو جائے کہ وہ کیسا ہے؟ اور کیا چاہتا ہے؟ یہ معلوم کر کے جب کوئی اُس کی مرضی کے تابع ہوتا ہے تب وہ شخص اپنی ٹھیک وضع کے منشاء میں قائم ہو کے خُدا کا مقبول اور مبارک بندہ ہو جاتا ہے۔

افسوس کی بات ہے کہ اس کہاوت کا مطلب بعض صوفیوں نے غلط سمجھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ **"اپنے نفس کا پہچاننا رب کا پہچاننا ہے"** یعنی **" تمہارا نفس ہی تمہارا رب ہے"** اور یوں وہ ہمہ اوست کا دم بھرتے ہیں۔ یہ اُن کا خیال اس لئے غلط ہے کہ خود شناسی سے حاصل نہیں ہوتا ہے بلکہ خود فراموشی سے یہ جہالت نکلتی ہے۔

رات دن کے تجربوں سے ہمیں معلوم ہے کہ جس کسی آدمی پر خُدا کا فضل شروع ہوتا ہے۔ پہلی بات جو وہاں نظر آتی ہے یہی ہے کہ وہ شخص اپنے آپ کو پہچاننے لگا کہ میں بڑا گنہگار، سخت ناتواں، نہایت محتاج ہوں، نادان ہوں، نکما ہوں۔ **خود شناسی خُدا شناسی کی پہلی منزل ہے** جس قدر ہم معرفت ایزدی (خُدائی) میں بڑھتے جاتے ہیں اُسی قدر ہم آپ کو زیادہ پہچانتے جاتے ہیں۔ آخر کار ہم بڑے عارف ہو کے یوں کہتے ہیں یقیناً ہم سب سے زیادہ خطاکار، سب سے زیادہ نادان، سب سے زیادہ ناتواں اور بالکل رحم کے محتاج ہیں اور خُدا تعالیٰ نہایت مہربان، نہایت پاک، بڑا دانا، بڑا حکیم، بڑی قدرت اور طاقت والا ہے۔ اُس نے یسوع مسیح میں ہمارے لئے بڑا ہی رحم کا دروازہ کھولدیا اور ہم اُس میں داخل ہو کے ضرور بچ گئے ہیں۔

کلام اللہ سے جو معرفت ہمیں حاصل ہوتی ہے اُس کا خلاصہ تو یہی ہے جو میں نے اوپر سُنایا لیکن یہ بھید جس پر کھلتا ہے وہی اِس کا لطف اُٹھاتا ہے اور اپنے کو ایسا اور خُدا کو ویسا دریافت کر کے اپنی رُوح کو بڑے چین کے مقام میں پاتا اور خُدا میں خوشی مناتا ہے۔

اس بیان سے میرا یہ مطلب ہے کہ کتاب اللہ یعنی **بائبل شریف جو سارے جہان کی ہدایت کے لئے خُدا نے نبیوں سے لکھوائی** ہے اُس میں بھی یہی طریقہ برتا گیا ہے کہ لوگ وسیلہ خود شناسی کے خُدا شناسی تک پہنچ جاتے ہیں اور یہ وہی بات ہے کہ جب تک کوئی اپنے آپ کو بیمار نہ جانے طبیب کے پاس نہیں آتا۔ یہ سب لوگ جو مذہبوں کی بابت جھگڑتے پھرتے ہیں بے فائدہ کام کرتے ہیں۔ چاہئے کہ سب تکرار اور مباحثہ

چھوڑ کے ذرا اپنی طرف متوجہ ہوں اور دریافت کریں کہ ہم کون ہیں؟ اور کیسے ہیں؟ تو اُن کے سامنے سے بہت سی مشکلات خود بخود حل ہو جائیں گی اور وہ اپنے اندرونی امراض سے آگاہ ہو کے علاجِ مناسب کے جویاں (تلاش کرنے والے) ہوں گے اور اُس وقت اُنہیں معالج نظر آجائیگا اور وہ اُس کے پاس آ کے صحت بھی پائیں گے۔

دنیا میں یہی حال ہو رہا ہے کہ ہر تکراری اور بکواور جھگڑالو آدمی جب اپنی بکواس سے چپ کر کے اپنے گریبان میں سر ڈالتا ہے اور اپنی طرف دیکھتا ہے۔ تب اُسے معلوم ہوتا ہے کہ ہر طرف اندھیرا ہے صرف کلام اللہ میں روشنی ہے۔ بلکہ کلام اللہ کے کسی ایک ہی فقرہ کا جلال اس کی روح کو خُدا کی طرف کھینچ لاتا ہے اور زندگی کے سوتے تک پہنچا دیتا ہے۔ کس کو؟ اُس کو جو اپنی حالت پر متوجہ ہو کے اور اپنے آپ کو بیمار دریافت کر کے صحت کا طالب ہوتا ہے۔

دفعہ ۲

ماخذ خیالات کتاب ہذا کے بیان میں

اس کتاب کے ماخذ خیالات کے بارے میں چند مہینوں تک میں فکر مند رہا۔ اگرچہ میں یہ جانتا تھا کہ **بائبل شریف کے سوا دنیا میں کوئی کتاب ایسی نہیں ہے کہ انسانی کیفیت کو پورا پورا بیان اُس میں ہو**۔ لیکن بعض آدمی بائبل شریف پر ایمان نہیں رکھتے اور اُس کی دلیلوں پر توجہ نہیں فرماتے۔ وہ ہمیشہ دنیاوی حکیموں کے عقلی خیالات کی طرف تاکا (دیکھنا) کرتے ہیں پس اُن کے لئے مجھے ایسے خیالات کی تلاش اور تنقید میں کچھ عرصہ تک رہنا پڑا اور جہاں تک اُن کے ایسے خیالات میں نے پائے اور پرکھے اُن میں میری کچھ سیری نہیں ہوئی اور بہت ہی تھوڑا سا ذخیرہ تنقید کے بعد میرے ہاتھ میں رہ گیا۔ اگر صرف اُسی کو اس کتاب میں لکھتا تو یہ کتاب **"مِراۃ الانسان"** نہ ہو سکتی تھی کیونکہ وہ بہت ہی تھوڑی باتیں ہیں۔

پس میرا وہ اعتقادی خیال اس وقت اور بھی زیادہ پختگی کو پہنچ گیا کہ انسان کی کیفیت اور اُس کی پوری حالت کا بیان صرف اُس کا خالق ہی کر سکتا ہے جو انسان سے واقف ہے یہ کام بھی آدمیوں سے پورا نہیں ہو سکتا ہے۔ عقلی اور علمی روشنی سے آدمی آپ کو جیسا چاہے پہچان نہیں سکتے۔ الٰہی آسمانی الہامی روشنی جب آدمیوں پر چمکتی ہے تب وہ آپ کو پہچانتے ہیں کہ ہم کیسے ہیں؟ پس میں حکمائی خیالات کی طرف سے بہت ہٹ گیا اور کلام کی طرف متوجہ ہوا کہ اُس کی ہدایت کے سامنے کسی حکیم کی رائے تسلی بخش چیز نہیں ہے۔

اوراس وقت میں ناظرین سے یہ بھی کہتاہوں کہ انسان کی کیفیت اور حالت کا بیان جو بائبل شریف میں ہے تین قسم پر منقسم ہے۔

(۱)انسان کی ابتدائی حالت کا بیان ہے کہ وہ کیونکر اور کس مطلب سے پیدا کیا گیا؟

(۲)اُس کی انتہائی حالت کا بیان ہے کہ اُس کا انجام کیا کچھ ہو گا؟

(۳)اس کی حالت موجودہ کا بیان ہے کہ آدمی فی الحال کیسے ہیں؟اُن کی حالت کیسی بگڑی ہوئی ہے اور اُن کی اصلاح کیونکر ہو سکتی ہے؟

پس ان تین قسموں کے بیان میں سے پہلی اور دوسری قسم کا بیان حکما(حکیم کی جمع) سے کچھ نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ غیب کی خبریں ہیں جو عقل سے نہیں کھل سکتیں۔ہاں وہ کچھ امکانی تجویزیں سنایا کرتے ہیں جن کا کچھ ثبوت نہیں ہوا کرتا۔

البتہ تیسری قسم کا بیان دنیا کے لوگ کچھ کر سکتے ہیں اور کچھ کیا بھی ہے۔لیکن یہ بھی پورا پورا بیان اُن سے نہیں ہوا۔جہاں تک اُن کی عقل دوڑی وہ کچھ بولے ہیں اور اس بیان کے دوسرے حصہ میں انسان کی اصلاح کیونکر ہو سکتی ہے؟ بڑے اختلاف ان لوگوں میں ہیں اور یہ سب مذہب جو دنیا میں جاری ہیں ۔یہ سب اُن کے اختلافات کی وجہ سے جاری ہیں اور اصلاح کی راہ کچھ نہ کچھ دکھاتے ہیں۔

لیکن اس مقام پر دو سوال کرنے لازم ہیں

اول

اُن کی بیماری کیا ہے اور تُم اُس کا علاج کیا بتاتے ہو اور اُس علاج کو کیا نسبت اس بیماری سے ہے؟

دوم

ان کے اُس علاج سے جو تم بتاتے ہو کس کس نے صحت پائی ہے؟اُن کے نام بھی پیش کیجئے؟

یہ دونوں سوال دنیا کے سب جھوٹے مذہبوں کو گرادیتے ہیں اور عیسائی دین کی عظمت دکھاتے ہیں۔دنیاوی مذاہب نہ انسان کی بیماری کا حال پورا پورا سناتے ہیں نہ اُس کا علاج مناسب دیکھاتے ہیں نہ صحت یافتوں کے نمونے پیش کر سکتے ہیں۔اُن کے اہل ناحق لڑنے پھرتے ہیں۔

کلام اللہ جو بائبل شریف ہے اُس میں انسان کی نسبت ماضی اور حال واستقبال کا پورا بیان لکھا ہوا ہے اور تسلی بخش ہے اور اصلاح کی راہ ایسی دکھلاتا ہے جو کیفیت بیان شدہ یا تشخیص شدہ کے مناسب ہے اور اُس سے ہزار ہا ہزار آدمی صحت یافتہ ہیں اور ہم نے خود اس راہ سے صحت پائی ہے۔پس اب فرمایئے کہ یہ کونسی عقل کا حکم ہے کہ ہم اس کلام اللہ کی طرف سے جو ایسا ہے چشم پوشی کر کے اُن حکما کے اُن چند بے سروپا خیالات ہی کی طرف تکا کریں اور اُن ہی کو اعلیٰ درجہ کی دلیلیں سمجھیں اُن میں کیا عُلویت (بُلندی) گھس رہی ہے وہ تو وہم سے ہیں۔

ہاں یہ میں کہتا ہوں کہ جو کچھ ان لوگوں نے درست طور سے کہا ہے۔ہم بہ شکر اُسے قبول کریں گے اور تکمیل و ترقی کے لئے کلام اللہ کی طرف متوجہ ہونگے اور کلام میں انسان کی حالتِ موجودہ کا جو ذکر ہے اُس پر غور کریں گے۔کہ فی الواقع انسان ایسا ہی ہے یا نہیں۔اگر انسان ایسا نہیں ہے تو خیر جانے دو کلام کو نہ مانو اور اگر وہ ایسا ہی ہے تو عیاں راچہ بیاں(ف۔مثل۔ظاہر اور علانیہ چیز کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں)اپنی چشم دید اور تجربہ کی گواہی سے اس بیان کو قبول کر لو اور اصلاح کی فکر کرو اور اگر اپنی اصلاح آپ کر سکتے ہو تو کر لو اور جو اُسی بدحالت میں مرنا منظور ہے تو اختیار باقی ہے اور اگر اصلاح چاہتے ہو اور خود نہیں کر سکتے تو اُس معالج کے پاس چلے آؤ جو بائبل میں ظاہر ہوا ہے اور اُس کی دوا بھی کھاؤ تب دیکھو گے کہ کیا ہو گا۔

دفعہ ۳

ایمان کے بیان میں

انسان کی ابتدا اور انتہا کی بابت جو بیانات بائبل میں ہیں وہ سب ایمان سے مانے جاتے ہیں آپ لوگوں میں ایمان ہے یا نہیں؟

ایمان نام ہے اُس یقین کا جو اُن نادیدہ اور معتبر اشخاص سے شنیدہ باتوں کی نسبت ہوتا ہے جو خُدا سے علاقہ رکھتی ہیں۔ اس لئے کہ وہاں تک عقلی تحقیقات کو رسائی نہیں ہوتی۔

ہم سمجھتے ہیں کہ سب آدمیوں کو ایمان کی ضرورت ہے اور صحیح ایمان جو لائق بھروسہ کے ہے۔ وہ صرف بائبل شریف میں بیان ہوا ہے۔ بعض آدمی ایمانی ضرورت کے تو قائل ہیں، لیکن بائبل کے باہر کچھ اَور طرح کے ایمان رکھتے ہیں جن کے وہ خوگر (عادی) ہو گئے ہیں۔ اُنہوں نے ایمانوں میں مقابلہ کر کے صحیح ایمان کی تلاش کبھی نہیں کی۔ وہ لکیر کے فقیر ہیں اور تحقیقات کے نام سے جلتے ہیں اور اگر بہ مجبوری عقل کچھ تحقیق کرتے بھی ہیں تو اُس جانب کو جھکتے ہیں جس میں اُن کی غرض قائم رہے۔ وہ حق کے طالب نہیں ہیں کہ راستی کی طرف جھکیں۔ بعض ایسے ہیں جو کچھ بھی ایمان نہیں رکھتے سب ایمانوں سے بیزار ہیں کیونکہ اُنہوں نے بعض ایمانوں کو جھوٹا پایا ہے۔ اس لئے سب جھوٹے ایمانوں میں سچے ایمان کو بھی ملا کے کہتے ہیں کہ سب ایمان غلط ہیں جو کچھ اُن کا دل چاہتا وہ کرتے ہیں۔

ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ اگر انسان میں بائبل والا ایمان نہ ہو اَور کوئی ایمان ہو یا نہ ہو وہ بے ایمان ہے اور اُس کی روح ہلاک ہو جائے گی۔

اس رسالہ کے ناظرین باایمان قسم اول اور قسم دوم کا بیان بھی قسم سوم کے ساتھ ضرور مانتے ہیں۔ لیکن وہ جو باایمان نہیں ہیں میں اُن سے کہتا ہوں کہ آپ لوگ قسم سوم کے بیان میں ضرور غور کیجئے اور سوچئے کہ آپ اُسی قسم کے آدمی ہیں یا نہیں۔ اتنی خودشناسی بھی مفید ہو گی اور ایمان بھی اس سے پیدا ہو جائے گا پھر آپ لوگ بہت کچھ خُدا سے پا سکتے ہیں۔

تینوں قسم کے بیان اس کتاب میں رلے ملے آتے ہیں ناظرین کو خود سمجھنا ہو گا کہ یہ کس قسم کا بیان ہے؟

اور یہ بھی یاد رہے کہ پہلی اور دوسری قسم کا بیان اگرچہ ایمان سے مانا جاتا ہے اور تیسری قسم کا بیان معائینہ فکری سے۔ تو بھی ہماری حالت موجودہ کا معائینہ ابتدائی وانتہائی بیانات کے درمیان ہو کے ایک خاص نسبت وعلاقہ ہم میں اور اُن دونوں بیانوں میں ظاہر کرتا ہے۔ اگر سنجیدگی سے بغور کچھ دیکھ سکتے ہو تو دیکھو اور یقین کرو کہ بائبل اپنے بیان میں برحق ہے۔

دفعہ ۴

خُدا تعالیٰ جل شانہ کے بیان میں

جہاں تک موجودات خارجیہ کی کیفیت آدمیوں کو معلوم ہوئی ہے یہی دریافت ہوا ہے کہ ہر خارجی موجود قائم بالغیر ہے۔ پھر وہ غیر بھی قائم بالغیر ہے اور ہو نہیں سکتا کہ یہ تمام قائم بالغیروں کا سلسلہ بھلا کسی علت "**قائم بالذات**" کے قائم اور موجود ہو سکے۔ علۃ العلل قائم بالذات کا ہونا عقلاً ضرور ہے۔ اُسی کا نام اہل علم نے "**واجب الوجود**" رکھا ہے اور یہ نام ایک ماہیت کی واجب ہستی کا ہے نہ کسی خاص شخص کا۔ اُس ہستی کا ہمسر کوئی نہیں ہو سکتا، اس لئے اُس کے ہمسر کا نام اُنہوں نے "**ممتنع الوجود**" رکھا ہے اور تمام جہان کی اشیاء مخلوقہ (خلقت) کو اُنہوں نے "**ممکن الوجود**" کہا کہ اُن کی ہستی کا ہونا یا نہ ہونا امر ضروری نہیں ہے بلکہ واجب الوجود صانع (خالق) کی مرضی پر موقوف ہے اور ہر چیز ایسی ہی ہے۔

دنیا کے شروع سے سب قوموں میں یہ خیال برابر چلا آتا ہے کہ ایک ہستی ہے جو از خود ازل سے ابد تک موجود ہے۔ اُسی سے سب ہستیاں موجود ہوئی ہیں۔ ہر زبان میں اُس ہستی کے لئے دو چار لفظ نہایت عمدہ پائے جاتے ہیں جنہیں اُس زبان کے اہل نے اپنے محاورات میں بہ تکریم (تعظیماً) استعمال کیا ہے اور اپنی روحوں کے لئے اُن کے مفہوم کو جائے پناہ دیکھا یا ہے مثلاً عبرانی میں لفظ "**الوہیمؔ**" ہے بمعنی "**معبودان**" صیغہ جمع کا ہے اور اُس ماہیت واحدہ کی نسبت استعمال ہوتا ہے۔ اور لفظ "**یہوواہؔ**" بمعنی "**ہستی قائم بالذات**" اُس کا اسم اعظم ہے۔ ایسا ہی لفظ "**خُدا**" ہے اصل میں "**خود آ**" تھا کہ اسم فاعل ترکیبی ہے بمعنی "**خود آینده که از خود موجود است**"۔

اِس ہستی کا ثبوت ہمیشہ استدلال اِنّی سے ہوتا ہے۔ جس میں معلول (اصطلاح منطق میں نتیجہ) سے علت کا سراغ لگاتے ہیں اور اس طرح اس کی صفات کا ثبوت ہوتا ہے اور دلائل اِنیہ اس مقصد پر جہان میں بکثرت موجود ہیں کیونکہ یہ بے شمار معلولات اس قسم کے دلائل پیدا کرتے ہیں۔ لیکن ان دلائل سے صرف اتنا ہی ثابت ہوتا ہے کہ کوئی ہستی قائم بالذات ضرور کہیں موجود ہے، جس کا نظیر معدوم ہے اور جس میں حکمتؔ، قدرتؔ اور ارادہؔ ہے۔ کیونکہ ہر معلول میں یہ تین صفتیں مستعمل نظر آتی ہیں۔ لیکن اُس ہستی کا علم بالکنہ (پکارنے یا ندا دینے کا طریق) کسی انسان اور فرشتہ کے بھی ذہن میں نہیں سما سکتا۔ اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم۔ وز ہر چہ گفتہ اند شنیدیم و خواندہ ایم۔ اگر اُسکی ذات و صفات کا علم بالکنہ کما ہو ہو کسی مخلوق کے ذہن میں سما سکتا تو وہ خُدا نہ ہوتا۔ مخلوقات کے احاطہ فکری میں خالق کا علم محدود ہو جاتا۔ وہ جو کہتے ہیں کہ پہلے ہمیں سمجھاؤ کہ خُدا کیا ہے؟ تب ہم ایمان لائینگے۔ اُن کا مقصد یہ ہے کہ پہلے ہم خُدا کے ہمسر یا اُس سے بڑے ہو جائیں، تب اسے مانیں گے۔ سوچو کہ یہ حماقت ہے کہ نہیں؟ کہ وہ لوگ لاانتہا کو اپنے ذہن کی نہتی ڈبیا میں بند کرنا چاہتے ہیں۔ کیا ایسا ہونا کبھی ممکن ہے؟

خُدا نے آپ کو بذریعہ ہماری عقل کے اور بذریعہ کتب الہامیہ کے ہمارے ظروف کے اندازہ پر ہمارے سامنے ظاہر کیا ہے۔ اور جس قدر اُس کے فضل سے ہمارے دلی اور خیالی طرف فراخ ہوتے جاتے ہیں، اس قدر زیادہ سے زیادہ ہم اُسے پہچانتے جاتے ہیں اور معلوم نہیں کہ کہاں تک ترقی ہماری ہو گی؟

بڑی بحث جو اہل دنیا خُدا کی بابت ہم سے کرتے ہیں وہ وحدت اور تثلیث کے بارے میں ہے۔ جس کا مفصل بیان اِس مختصر رسالہ میں نہیں ہو سکتا۔ انشاءاللہ آئندہ کسی کتاب میں ہو جائیگا اس وقت چند فقرے اجمالاً (اختصار کے ساتھ) یہاں لکھنا کافی ہے۔

عقل سے جہاں تک خُدا معلوم ہو سکتا ہے آدمی جانتے ہیں اور جان سکتے ہیں لیکن زیادہ ترقی اس بارے میں عقل سے نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ خود نہ بتلائے کہ میں کیا ہوں؟ اور یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ یقیناً اُس نے دنیا میں پیغمبر بھیجے اور الہام دیا جو بائبل میں ہے۔ پس ہم عقلی ہدایت سے کچھ زیادہ اس بارے میں اُس کے کلام سے سیکھتے ہیں اور زیادہ روشنی اور تسلی حاصل کرتے ہیں۔ کیونکہ جو کچھ کلام سکھاتا ہے وہ عقل کے خلاف نہیں ہے۔ یا عقل کے مناسب ہے یا عقل سے بلند ہے۔ اور یہ بات ہمیں خوب معلوم ہے کہ ضرور خُدا تعالیٰ ہمارے فہم سے بلند و بالا ہے۔

خُدا واحد ہے۔ یہ بات برحق ہے اور ہم ایمان سے کہتے ہیں **لاالٰہ الااللہ** لیکن یہ کہنا کہ خُدا واحد ہے اس کا مطلب کیا ہے؟ غور طلب بات ہے۔ **خُدا نام ہے ایک ماہیت کا جیسے انسانیت، حیوانیت، ملکیت وغیرہ ماہتیں ہیں۔ الوہیت بھی ایک ماہیت ہے** اور سب ماہتیں قائم بالغیر اور مرکب ہیں۔ وہ ماہیت غیر مرکب اور قائم بالذات ہے۔ ممتاز بے نظیر اور ازلی وابدی سب ماہتیوں کی موجد اور سب کے اوپر حاکم ہے۔

لیکن اس کی وحدت کیسی ہے؟ عقل سے اس کا بیان نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وحدت فردی اور نوعی اور جنسی کو وہاں دخل نہیں، ورنہ خُدائی کی شان نہیں رہتی ہے اور نہ وحدت وجودی ہے جو مغایرت (اجنبیت) کو معدوم کرتی اور اپنے قائل کو بڑا مشرِک بلکہ منکر خُدا بناتی ہے۔ یہی کہنا پڑتا ہے کہ اس کی وحدت کچھ اور ہی قسم کی ہے جو فہم سے بلند و بالا ہے۔

کلام سے ثابت ہوا کہ اس کی ماہیت واحدہ ہے اور اس میں تین اقوم ہیں یعنی تین شخص "آب"، "ابن"، "روح القدس" اُن کے نام ہیں۔ جو ماہیت "اب تعالیٰ" کی ہے وہی ماہیت "ابن" اور "روح القدس" کی ہے کیونکہ اُن کا جوہر ذات ایک ہے۔ صفات بھی ایک ہیں۔ حکمت، قدرت اور ارادہ ایک ہے۔ صرف تعدد شخصی ہے، ورنہ ہر طرح سے ایک ہیں اور یہی واحد خُدا ہے۔ خُدا نے اپنی ذات کا بیان اپنے کلام میں یوں ظاہر کیا ہے اور ہم اُس کے فضل سے سمجھے ہیں کہ یہ حق ہے۔ اِسی کا ماننا خُدا کا ماننا اور اس کا انکار خُدا کا انکار ہے۔ یہ خیال خُدا نے ظاہر کیا پیغمبروں سے پہنچا اور بائبل شریف میں بہ تفصیل بیان ہوا اور مومنین کے دلوں اور خیالوں میں زندگی اور روشنی بخش نظر آیا اور فکر سے دریافت ہوا کہ خُدا اِس عقیدہ کا حامی ہے۔ بلکہ ساری پاک روحانی برکتیں اور معرفتِ الٰہی کے اسرار اُنھیں آدمیوں کے حصہ میں ہیں جو اِس واحد فی التثلیث خُدا کو مانتے ہیں۔ تم خود سوچو کہ تمام دنیا کے اہل مذاہب میں معرفت الٰہی اور خُداشناسی کے بارے میں کونسا فرقہ بڑھا ہوا ہے؟ صرف عیسائی لوگ۔ اس کا سبب یہی ہے کہ **حقیقی اور زندہ خُدا بھی بائبل والا خُدا ہے** جو ان کی روحوں میں بوسیلہ اس ایمان کے موثر ہے اور نور بخش ہے۔ اُور اہل مذاہب جو تاریکی میں رہتے ہیں اس کا سبب یہی ہے کہ اُن کے فرضی اور وہمی یا عقلی خُدا جو فی الحقیقت ناچیز شے ہیں کچھ روشنی اور زندگی اُن میں داخل نہیں کر سکتے۔ جب سب بطلان دفع ہونے کا وقت آئے گا یہ سب لوگ بے خُدا کھڑے رہ جائیں گے اور حقیقی زندہ خُدا اہل انجیل کے ساتھ سب کو معلوم ہو جائیگا۔

دفعہ ۵

لفظ انسان کے بیان میں

لفظ انسان کی اصل ''اِنسی'' ہے۔ لفظ ''انسی'' پر زیادتی معنی کی غرض سے الف نون زیادہ کیا گیا جیسے رحماں میں کثرت رحم دکھانے کے لئے الف نون زیادہ کیا گیا ہے۔ پس ''اِنسی'' سے ''انسیان'' بنا کثرت استعمال سے یائے تحتانی (وہ حرف جس کے نیچے نقطے ہوں) گر گئی (یعنی ختم کر دی گئی) انسان رہ گیا۔ لفظ ''اِنسی'' ضد ہے ''وحشی'' کی۔ ''انسان'' کے معنی ہیں ''وہ شخص جو بڑے محبت واُنس والا ہے''۔ مذکر، مونث، واحد و جمع سب اس میں یکساں ہیں۔ انسان کی حالت تمدنی کا بیان اس لفظ میں خوب ہے۔ اب آپ سوچیں کہ اگر ہم کینہ توز اور خود غرض اور بے محبت اور وحشی مزاج ہوں تو ہم اسم با مُسمّٰی (جیسا نام ویسے گُن) انسان ہیں یا نہیں اور ایسے لوگوں نے کہاں تک اپنی وضع سے انحراف کیا ہے؟

دفعہ ۶

لفظ آدم کے ذکر میں

''آدم'' نام ہے اُس شخص کا جو پہلا انسان اور سب انسانوں کا باپ تھا۔ اس لفظ کے معنی ہیں ''مٹی یا سرخ مٹی'' کیونکہ وہ شخص سرخ مٹی سے بنایا گیا تھا۔ اگرچہ اس کی بناوٹ میں اور سب مخلوقات ارضی کی ساخت میں بڑا امتیاز ہے کہ وہ عجیب طور سے بنا ہے اور اس میں زندگی کا دم خُدا نے پھونکا ہے۔ اور وہ سب ارضی مخلوقات پر حاکم ہے بلکہ تمام کارخانہِ زمین اسی کے لئے تیار ہوا ہے۔ تو بھی اُس کا نام ''آدم'' ہے یعنی ''مٹی''۔ اس لفظ میں اُس کے جُزا سفلی کا بیان ہوتا ہے کہ وہ یاد رکھے کہ میں آدم ہوں یعنی مٹی۔ پس ہم سب کو چاہئے کہ اس لفظ کے معنی یاد رکھیں اور خاکسار رہیں۔ مغروری کی سربلندی کو دل میں جگہ نہ دیں کہ ہم خاک ہیں اور خاک میں جائیں گے۔ ''خاک شو پیش از آں کہ خاک شوی''۔

دفعہ ۷

لفظ حوا کا بیان

اس لفظ کے معنی ہیں ''زندگی''۔ یہ نام آدم نے اپنی بی بی کو دیا تھا کیونکہ وہ سب زندوں کی ماں ہے (پیدائش ۳:۲۰)۔ اِس عورت کی پیدائش نر میں سے ہوئی تھی۔ اسی لئے ناری کہلاتی ہے کہ نر میں سے نکلی۔ **خُدا نے آدم کو ایک ہی عورت دی تھی۔ اس سے خُدا کا قانون معلوم ہوا کہ ہر مرد کو ایک ہی عورت چاہیئے۔** عورتوں کی کثرت کا دستور آدم کے پوتے لمک بن قائن نے سب سے پہلے دنیا میں نکالا ہے۔ عدہ اور ضلہ اُس کی دو بیویاں تھیں (پیدائش ۴:۱۹)۔ یہ آدمی خونی تھا اور اس کا باپ قائن بھی خونی تھا۔ اب جو کوئی ایک سے زیادہ عورتیں جمع کرتا ہے وہ اس شخص کی سنت پر چلتا ہے خواہ وہ نبی ہو یا غیر نبی۔ یہ سچ ہے کہ پرانے عہد نامہ کے انتظام میں یہ دستور کچھ معیوب نہ تھا اور خُدا تعالیٰ نے بھی اس معاملہ میں کچھ طرح (درگزر) سی دی تھی۔ کسی حکمت کے سبب سے لیکن جب پاکیزگی کا کمال ظاہر ہوا تو سب کچھ صاف روشن ہوا ہے۔ خُدا نے ایک جوڑا آدم اور حوا کا شروع میں پیدا کیا اور اب دیکھو کہ یہ زمیں اُس جوڑے کے بچوں سے کس قدر معمور ہے۔

دفعہ ۸

وحدت ابوی کا بیان

سب آدمی بنی آدم کہلاتے ہیں۔ '' بنی'' اصل میں ''بنیں'' تھا۔ نون جمع کا باضافت گر گیا یعنی آدم کے فرزند۔ یہ آواز دنیا کے شروع سے چلی آتی ہے کہ سب آدم کے بچے ہیں کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ خیال تھوڑے دنوں سے مشہور ہوا ہے۔

ہم نے سُنا ہے کہ آدم ایک خاص شخص تھا اور اُس کی ایک خاص زوجہ تھی اور اُن دونوں کو خالق نے کچھ اور ہی قاعدہ سے پیدا کیا تھا۔ اُن سے یہ سب آدمی پیدا ہوئے ہیں اور اسی آدم کی طرف منسوب ہو کے '' بنی آدم'' کہلاتے ہیں۔ اگر یہ خیال درست ہے تو ''وحدت ابوی'' کے سبب سے ہم سب ایک ہی گھرانے کے بچے ہیں۔

بعض اشخاص نے ''وحدت ابوی'' کے بارے میں اختلاف ظاہر کیا ہے۔ پس ان کے گمان میں کئی ایک آدم ہوں گے لیکن اُن کی دلیلیں جو اس بارے میں ہیں تسلی بخش نہیں ہیں۔ اُنہیں عقل سلیم قبول نہیں کرتی۔ ''وحدت ابوی'' کا خیال بہت صحیح معلوم ہوتا ہے اور الہامی تواریخ میں ہے اور جہانگیر ہے۔ دلکش بھی ہے اور اس کے ثبوت کی تائید میں ہمارے پاس ذیل میں خیالات موجود ہیں۔ ان پر بھی غور و فکر کرو۔

۱۔سب دنیا کے آدمیوں میں بدنی ساخت یکساں ہے۔

۲۔ہر درجہ کے آدمیوں میں اخلاقی اور وحی کیفیت کے اصول مساوی ہیں۔اور اس سے اتحاد نوعی ظاہر ہو کے منبع کی وحدت دکھاتا ہے۔

۳۔آدمیوں میں کچھ تفریقیں بھی ہیں، لیکن ایسی تفریقیں نہیں ہیں جیسی مختلف انواع کے جانوروں کی آمیزش سے اُن کے پھلوں میں ہوتی ہیں۔ آدمیوں میں جو تفریقیں ہیں وہ مختلف ممالک کی آب و ہوا اور مختلف اطوار معیشت اور تاثیرات ملکیہ کے سبب سے ہیں۔ چنانچہ افریقہ ،ایشیا اور یورپ کے باشندوں میں کچھ فرق سا نظر آتا ہے مگر انسانیت کے ذاتی اصول برابر ہیں۔

۴۔علم ترکیب ارضی سے ثابت ہو گیا ہے کہ ترکیبی نسلیں آگے نہیں بڑھتیں، صرف فطری نسلیں آگے چلتی ہیں۔ پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ مختلف ممالک کے آدمی آپس میں شادی بیاہ کرتے ہیں اور اُنکی نسلیں برابر دنیا میں چلتی ہیں۔اس سے وحدت ابوی ظاہر ہے۔

۵۔کل بنی آدم میں نوعی موانست ہے اور یہ سرچشمہ کی وحدت کے سبب سے ہے اور اَور قیاس بھی اسی طرح کے نکلتے چلے آتے ہیں۔ ہمارے دلوں کو مستعد کرتے ہیں کہ ہم بموجب ہدایت بائبل شریف کے آدمیوں میں وحدت ابوی کے قائل ہوں اور کہیں کہ ہم سب آدم کے بچے ہیں۔ کسی کا باوا آدم نرالا نہیں ہے اور یہ جدائیاں جو باطل تعلیمات نے آدمیوں میں ڈالی ہیں نادانی اور مغروری کے سبب سے ہیں اور بہت مضر ہیں۔ انجیل شریف ان جدایوں کو دور کرتی ہے اور سب آدمیوں میں ایک ہی لہو ثابت کرتی ہے۔اب وہ سب لوگ جنہیں دنیا کے خود پسند لوگوں نے ذلیل ٹھہرا کے الگ کھڑا کر رکھا ہے چاہئے کہ خوشی کا نعرہ مار کے مسیح یسوع خُداوند کی جماعت میں چلے آئیں کہ وہی ہے جو سب کا حق دیتا ہے۔

دفعہ ۹

اِنسان ایک خاص وقت سے دنیا میں ہے

آدم کسی خاص وقت میں موجود ہوا تھا وہ ہمیشہ سے نہ تھا۔ لیکن وہ کب پیدا ہوا تھا؟اُسے کتنے برس کا عرصہ گزرا؟اس کے سن سال کا قطعی ثبوت ہمارے پاس نہیں ہے۔احتمالی ثبوت ہے نہ قطعی۔اور وہ یہ ہے کہ عہد عتیق کے عبرانی نسخوں کے نسب ناموں پر فکر کر کے ہمارے بزرگ عالموں نے یوں دریافت کیا ہے کہ آدم ہمارے خُداوند یسوع مسیح سے (۴۰۰۴) برس پہلے دنیا میں پیدا ہوا تھا اور اس تعداد کے ساتھ اس وقت (۱۸۸۹) مسیحی برس ملانے سے (۵۸۹۳) برس آدم کو ہوتے ہیں۔ عموماً کلیسیاء میں یہ تعداد مسلم ہے بلکہ کلام اللہ کے حاشیہ پر بھی مرقوم ہے۔ کیونکہ پرانے نسب ناموں کے حساب سے بھی تعداد اتنی ہے۔

سپتواجنت Septuagint اور تواریخ یوسیفس Josephus سے جہاں حدیثوں کی بھی رعایت ہے۔آدم سے مسیح تک (۵۵۰۰) برس کا عرصہ نکلتا ہے۔اس لئے ہم برسوں کی تعداد قطعاً معین نہیں کر سکتے اور نہ کسی تعداد پر زور دیتے ہیں کیونکہ ہمارا کوئی ایمانی مسئلہ کسی تعداد پر موقوف نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہی حساب درست ہو جو عبرانی نسخوں سے آتا ہے۔

ہاں اس بات کا ثبوت ہم پر واجب ہے کہ جہاں کی پیدائش میں آدم خُدا تعالیٰ کی آخری مخلوق تھا اور کہ چھٹے دن میں آدم اور حوا کی پیدائش ہوئی ہے۔ان کی پیدائش کے بعد کسی اور چیز کی پیدائش کا ذکر نہیں ہے۔ یہاں سے دو باتیں نکلتی ہیں۔

اول آنکہ وہ جوڑا آدم اور حوا کا تمام پیدائش میں آخری مخلوق تھا۔

دوم ان کی ساری جسمانی پیدائش کا مقصد وہی جوڑا تھا جس پر خالق نے پیدائش کا کام تمام کر دیا تھا۔

وہ جو کہتے ہیں کہ آدمی ہمیشہ سے یوں ہیں، برابر چلے آتے ہیں غلطی پر ہیں کیونکہ ان کے لئے ابتدا ضرور ثابت ہے۔

علم ترکیب ارضی ثابت کرتا ہے کہ انسان کا وجود ایک خاص وقت میں نظر آیا ہے۔وہ لاانتہا عرصہ سے نہیں ہے اور جب کہ علمی طور سے یہ بات معلوم ہو گئی تو پھر کلام اللہ پر ایمان لانے میں کیا حجت ہے ؟

ہر ابتدا کے لئے انتہا ہے اور انسان کے لئے ابتدا ثابت ہے پس انسان کے لئے انتہا بھی آئے گی۔اور چونکہ انسان کی رُوح غیر فانی مخلوق ہے، اس لئے اُس کی انتہائی بھی ہے کہ وہ دوسری حالت میں جائے۔اُسی کا نام آخرت ہے۔اُس وقت ولادت کا قاعدہ بند ہو جائیگا اور جہان کے کام تمام ہو جائیں گے۔ قدرت الٰہی کچھ اور ہی رنگ دکھائے گی۔اگر مرضی ہو تو نبیوں کی بات مان لو کہ آخرت آنے والی ہے ورنہ انسان کے لئے علمی طور سے ازلیت ثابت کرو اور علم ترکیب ارضی کو جو انسان کے لئے ابتدا ثابت کرتا ہے خاک میں دبا دو جہاں وہ پہلے دبا تھا یا کہو کہ ہر ابتدا کے لئے انتہا ثابت نہیں ہے اور اپنی تمیز کو آپ ہی جواب دو۔

دفعہ ۱۰

آدم کیونکر پیدا ہو گیا

دنیا کے سب آدمی قاعدہ معمولی کے موافق والدین سے پیدا ہوتے ہیں اور یہ اُن کے لئے فطری قاعدہ ہے۔ چنانچہ سب حیوانات کے لئے بھی قواعد فطریہ مقرر ہیں۔اگر یہی قاعدہ شروع سے ہے تو پہلے جوڑے کے والدین کون تھے ؟اور اُن میں سے بھی ہر فرد کے لئے ایک جوڑا چاہیئے۔دَور تو کسی طرح سے ہو ہی نہیں سکتا کہ اُس جوڑے کا وجود ہم پر موقوف ہو اور ہمارا وجود اُس پر۔

اور تسلسل بھی باطل ہے اور یہ خوب ثابت ہے کہ انسان سب سے پیچھے پیدا ہوا ہے۔پس وہ پہلا جوڑ ایقیناً قاعدہ معلومہ کے خلاف کسی اور قاعدہ سے پیدا ہوا ہو گا اور یہ قاعدہ معمولی اُس کی پیدائش کے بعد جاری ہوا ہے۔

اب حجت اس میں ہے کہ وہ جوڑا کس قاعدہ سے اور کیونکر پیدا ہوا تھا؟اگر کوئی آدمی اپنی عقل سے کہے کہ اِس طرح سے یا اُس طرح سے ہوا ہو گا تو یہ سب اُس کے بیان عقلی امکان ہوں گے یا قوت واہمہ کے توہمات ہونگے جن سے کسی امر کا ثبوت نہیں ہوا کرتا ہے۔اور کوئی نظیر بھی دنیا کی

تواریخ میں نہیں ہے کہ کوئی انسان کبھی اتفاق سے یا ترکیب بہائی وغیرہ سے پیدا ہو کے آدمیوں کے جُھنڈ میں آملا ہو جس پر قیاس کر کے اُس پہلے جوڑے کو بھی ایسا ہی سمجھیں۔ حالانکہ اس وقت جو انسانی جوڑے دنیا میں موجود ہیں اُس پر غور کرنے سے اُنکی بناوٹ میں عجیب حکمت اور ارادہ صانع کا پایا جاتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پہلا جوڑا جو ان سب جوڑوں کا سانچا تھا اور کچھ اَور ہی قاعدہ سے بنا تھا۔ وہ قاعدہ اپنے وقت پر ظاہر ہو کے پوشیدہ ہو گیا ہے اور یہ معمولی قاعدہ جاری کر گیا ہے۔ چنانچہ تمام دنیاوی فطری قواعد مقررہ کی جڑوں میں کچھ اَور ہی قاعدے صانع کے پاس بچشم غور نظر آتے ہیں جو آدمیوں کی سمجھ سے باہر ہیں اور وہ اپنے وقتوں پر ظاہر ہوتے ہیں۔ وہ عام نہیں ہیں کہ ہر وقت نظر آیا کریں۔ اُنہیں قواعد مخفیہ سے بوقت مناسب معجزات بھی ہوتے ہیں جو سچے معجزے کہلاتے ہیں۔

کوتاہ اندیش لوگ جو خُدا کی معرفت سے بے نصیب ہیں اُنہیں چند فطرے معلومہ قواعد میں خُدا کی ساری قوت کو منحصر سمجھ کے گمراہی کے گرداب میں ناحق ڈبکوں ڈبکوں کر رہے ہیں۔

بیدار مغز آدمی گہری نگاہ سے دیکھتا ہے کہ کیا ہے؟ بائبل شریف کی صدہا باتیں اسی دنیا میں برحق ثابت ہو چکیں ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اُس جوڑے کی پیدائش کا ذکر جیسے کہ اُس میں لکھا ہے مانا نہ جائے؟ حالانکہ عقلِ سلیم صاف کہتی ہے کہ یہ بیان خُدا کی شان کے مناسب ہے۔

(پیدائش ۲:۷) میں لکھا ہے کہ خُدا نے آدم کو خاک سے بنایا۔ یہ اُس کے جسمی مادہ کا ذکر ہے اور اس بات کا بیان ہے کہ وہ حیوانی ترکیب سے نہیں نکلا بلکہ خُدا نے خاک کا ایک پتلا بنایا اور اُس میں خُدا نے زندگی کا دَم پھونکا۔ یہ اُس کے دوسرے جز کا ذکر ہے جس کو "نفس ناطقہ" کہتے ہیں جو عالم بالا سے اُس میں ڈالا گیا۔ (پیدائش ۱:۲۷) میں مرقوم ہے کہ خُدا نے اُسے اپنی صورت پر بنایا۔ **"صورت" سے مراد یہ ہے کہ انسان کی ظاہری اور باطنی روحانی واخلاقی صورت ایسی بنائی کہ خُدا کے ساتھ ایک خاص نسبت اور مشابہت اور علاقہ اُس کا ہوا۔**

مُشبَّہ اور مُشبَّہ بِہ میں موافقت کلی تو کبھی نہیں ہوتی ہے ورنہ دوئی نہ ہو گی لیکن کسی قدر موافقت اور مناسبت بعض امور میں ہوا کرتی ہے۔ انسان میں اور خُدا میں پوری دوئی ہے۔ لیکن وہ ایسی صورت میں پیدا ہوا ہے کہ صفاتِ الٰہی کا گونہ مظہر اور تجلیات کا مہبط اور الٰہی مرضی واحکام کی بجا آوری کے لائق وضع میں ہے اور آزاد بھی ہے نہ مجبور اور عقل قبول کرتی ہے کہ ضرور انسان ایسی وضع میں ہے۔ اگرچہ وہ صورت اُس کی بعد گناہ کے بگڑ گئی ہے تو بھی شعر

از نقش ونگار درودیوار شکستہ ۔ آثار پدید است صنا دید عجم را ۔

اور اس سے یہ بھی ثابت ہے کہ وہ اتفاقی مخلوق نہیں بلکہ ارادی ہے۔ **آدم کا جسم خاک سے بنا اور رُوح اللہ نے پھونکی لیکن اُس کی زوجہ کو اُس کی پسلی سے نکالا اور اُس کی روح کا ذکر نہیں ہے** کہ کہاں سے آئی؟ قیاس چاہتا ہے کہ جیسے جسم سے جسم نکلا ویسے رُوح سے رُوح پیدا کی۔ اسی لئے وہ مرد کی دبیل اور اُس سے کمزور ہے۔

اول خُدا نے زمین و آسمان کو حکم سے پیدا کر دیا اور وہ بے مادہ صرف حکم سے موجود ہو گئے ثانیاً اُس نے زمین کو حکم دے کر اُس سے حیوانات اور نباتات نکلوائے۔ ثالثاً آدم کو خود پیدا کیا۔ رابعاً آدم میں سے حوا کو نکالا۔ خامساً تولید کا قاعدہ جاری کیا۔ پس پہلا آدمی قائن پیدا ہو جو معمولی قاعدہ سے ہے۔

پہلے چار قاعدے عمل میں آئے۔ تب پانچواں قاعدہ جاری ہوا اور وہ قوت جس سے یہ کچھ ہوا خُدا میں ازل سے مخفی تھی اور اب بھی اس میں مخفی اور موجود ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ تو کیا کرتا ہے؟ یا تو نے ایسا کیوں کیا؟ کس کا منہ ہے جو ایسا بولے؟ البتہ کافر آدمی جو چاہتا ہے سو بکتا ہے اور اپنا نقصان کرتا ہے۔ لیکن خُدا کے عارف لوگ جانتے ہیں کہ اُس کے سارے کام راستی اور انصاف اور حکمت اور محبت کے ہیں۔ کوئی سمجھے یا نہ سمجھے ہاں **جنہوں نے اُس کی کتاب بائبل شریف کو اُس سے پڑھا ہے وہ غیروں کی نسبت زیادہ سمجھتے اور تسلی سے بھرے ہیں۔**

دفعہ ۱۱

ہم سب کیونکر پیدا ہوتے ہیں

اُسی قاعدہ سے جو پہلے جوڑے کی پیدائش کے بعد جاری ہوا ہے سب آدمی پیدا ہوتے ہیں۔ (پیدائش ۱:۲۸) خُدا نے اُس جوڑے کو پیدا کر کے برکت دی اور برکت میں چار لفظ فرمائے تھے۔

"پھلو اور بڑھو اور زمین کو معمور و محکوم کرو۔۔۔" (پیدائش ۱:۲۸) لفظ **"پھلو"** میں خُدا نے ہم سب کو اُس جوڑے میں یاد کیا تھا اور لفظ "بڑھو" میں سلسلہ تولید کے اجراء کا ذکر کیا تھا اور لفظ **"معمور"** میں خُدا کی نگاہ اُس بڑی آبادی پر تھی جو دنیا میں اب نظر آتی ہے اور لفظ **"محکوم"** میں وہ اختیارات اور تصرفات (قبضے) یاد کیے گئے تھے۔ جو اب دنیا میں آدمیوں سے ہو رہے ہیں اور بڑھتے جاتے ہیں اور جن کی تکمیل کا وقت چلا آتا ہے۔

ان الفاظ پر اور دنیا کی تواریخ اور حالت پر غور کیجئے کہ وہ برکت جو خُدا نے اُس جوڑے کو دی تھی کیونکر بتدریج پوری ہوتی اور ترقی کرتی چلی آئی ہے اور ان الفاظِ برکت میں کچھ صداقت نظر آتی ہے یا نہیں اور کہ یہ برکت کا بیان اور یہ کتاب پیدائش اُس وقت کی ہے یا نہیں کہ جس وقت دنیا میں اندھیرا تھا، نہ اس قدر آبادی تھی اور نہ ایسی حکمت تھی۔ لیکن ایک وقت آیا کہ یہ مضمون سچ نکلا تو اوپر کا بیان بھی جس کا یہ مضمون ایک حصہ ہے کیوں نہ سچ ہو گا۔

آدمی سے آدمی پیدا ہوتا ہے اس لئے تو آدم ہماری جسمانی موجودگی کا ایک ظاہری وسیلہ ہے۔ (۱۔کرنتھیوں ۱۵:۴۵)۔ جسم سے جسم پیدا ہوتا ہے اور رُوح سے رُوح پیدا ہوتی ہے (یوحنا ۳:۶) اور والدین کی جسمانی ساخت اور کچھ نہ کچھ بلکہ بہت کچھ مزاجی اور اخلاقی کیفیت بھی اور امراض متعدیہ

(متعدّی امراض۔ چھوت چھات سے پیدا ہونے والی بیماریاں) بھی اولاد میں نظر آتی ہیں جن کا انکار نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے یہ کہاوت مشہور ہوئی ہے کہ ''باپ پر پُوت پتا پر گھوڑا' بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا''(ہندی مثل۔ ہر شخص پر کچھ نہ کچھ خاندانی اثر ضرور ہوتا ہے)۔

ظاہر ہے کہ والد سے رحم والدہ میں ایک قطرہ گرتا ہے۔ اُس میں ایک نقطہ ہے جو اس پیدا ہونے والے کی زندگی کا مرکز سا ہے۔ اُس میں الٰہی قدرت کا کچھ تصرف (دخل دینا۔ عمل) ہوتا ہے جو انسانی سمجھ سے بلند ہے ''تو نہیں جانتا ہے کہ۔۔۔ حاملہ کے رَحِم میں ہڈیاں کیونکر بڑھتی ہیں۔۔۔'' (واعظ ۱۱:۵)۔

ڈاکٹر کہتے ہیں کہ یوں یوں ہوتا ہے لیکن نہیں کہہ سکتے کہ یوں کیوں ہوتا ہے؟ کلام اللہ بتاتا ہے کہ انسان کی پیدائش امر اتفاقی نہیں ہے۔ خُدا کے ارادہ سے انسان رحم مادر میں ڈالا جاتا ہے (ایوب ۳۱:۱۵) جس نے مجھے رحم میں ڈالا اُس نے اسے بھی بنایا اور اُسی وقت سے الٰہی کمک اُس جنین یا بچہ کی نسبت معلوم ہوتی ہے۔'' خُداوند تیرا خالق جس نے رَحِم ہی سے تجھے بنایا اور تیری مدد کرے گا یوں فرماتا ہے۔۔۔''(یسعیاہ ۴۴:۴)۔ زبور نویس داؤد لکھتا ہے ''جب میں پوشیدگی میں بن رہا تھا اور زمین کے اسفل میں عجیب طور سے مرتّب ہو رہا تھا تو میرا قالب تجھ سے چھپا نہ تھا۔ تیری آنکھوں نے میرے بے ترتیب مادے کو دیکھا اور جو ایام میرے لئے مقرر تھے وہ سب تیری کتاب میں لکھے تھے''(زبور ۱۳۹:۱۵،۱۶)۔ یہ قدرتی کام مٹی میں شروع ہوتا ہے اور آدمی مٹی سے بنتا ہے۔'' ۔۔۔ میں بھی مٹی سے بنا ہوں''(ایوب ۳۳: ۶)۔ آدم اور حوا کے سوا سب آدمی والد کے صُلب سے پیدا ہوتے ہیں ۔ یعقوب کے چھیاسٹھ صُلبی فرزند مصر میں آئے تھے (پیدائش ۴۶:۲۶)۔ اسی طرح ہر آدمی کے لئے اوپر کی طرف ایک صُلبی سلسلہ ہے جو اُس کا ''نسب'' کہلاتا ہے۔ وہ نسب نامے جو انجیل متی و لوقا میں ہمارے خُداوند مسیح کے مذکور ہیں۔ وہ مریم اور یوسف کے ہیں۔ یوسف مسیح کا شرعی باپ تھا نہ جسمانی۔ مریم خداوند مسیح کی جسمانی والدہ تھی۔ مسیح کا بدن اُس کے خون سے بنا۔ لیکن وہ فقط جو اُس کے رحم میں آیا اُسی قدرت سے آیا تھا جس قدرت سے آدم بنا تھا (لوقا ۱:۳۵)۔

پس یوسف اور ابرہام و داؤد وغیرہ مسیح کے شرعی باپ تھے نہ صلبی اور مریم کے ساتھ خونی مشارکت (باہم شرکت کرنا۔ حصہ داری) کے سبب سے مسیح کا جسم اُن بزرگوں کا خون تھا اور مشارکت شرعی و جسمانی کے سبب سے وہ اُن کا فرزند کہلاتا ہے۔ سب آدمیوں میں ایک ہی لہو ہے اور ایک خاص قسم کا لہو ہے جو صرف آدمیوں میں ہے۔ اس کے اجزا تمام حیوانات کے خون سے الگ قسم کے اجزا ہیں۔ اس زمانہ میں یہ ثابت ہو گیا ہے کہ آدمی کا خون خاص قسم کا ہے اب آدمی دھوکا نہیں کھا سکتا کہ جانور کے خون اور آدمی کے خون میں امتیاز نہ کر سکیں۔ یہ آدم کا خون کل دنیا کے آدمیوں میں یکساں ہے اور اُس سے بھی وحدت ابوی ظاہر ہوتی ہے۔ خُدا نے ایک ہی لہو (اصل) سے آدمیوں کی سب قوموں کو تمام سطح زمین پر بسنے کے لئے پیدا کیا ہے (اعمال ۱۷:۲۶)۔ اور یہ بھی درست بات ہے کہ خون میں جوش ہے اور موانست (محبت۔ اُنس) کا ایک یہ بھی سبب بنی آدم میں ہے اور جدّی خون کا جوش اقرب موانست کا باعث ہے وہ کہاوت درست ہے ''آخر لہو نے جوش مارا''۔

دفعہ ۱۲

انسان کی اصطلاحی تعریف

انسان کیا چیز ہے؟ یا یوں کہو کہ ہم جو بنی آدم کہلاتے ہیں ہم کیا ہیں؟ اس سوال کا جواب اہل علم یوں دیتے ہیں ''انسان حیوان ناطق (بولنے والا جانور) ہے'' ۔انسان کی تعریف سب نے یہی کی ہے اور یہ تعریف درست اور صحیح ہے کیونکہ یہ جنس قریب اور فصل قریب سے انسان کی حد تام (مکمل) ہے اور اس سے بڑھ کر کامل تعریف اُس کی ہو نہیں سکتی۔

اب مناسب ہے کہ ہم سب اپنی جنس اور فصل پر غور کر کے آپ کو خوب پہچانیں اور اُس سے کچھ عمدہ نتائج نکالیں نہ یہ کہ عام لوگوں کی مانند اپنی تعریف کا فقرہ ہی سن کے چُپ کر رہیں۔

واضح ہو کہ جب ہم اپنی اجناس (جنس کی جمع) میں غور کرتے ہیں تو ہمیں نیچے کی طرف بہت اُترنا پڑتا ہے اور جب فصول (فصل کی جمع) کی طرف دیکھتے ہیں تب اوپر چڑھتے آتے ہیں۔

پہلے '' حیوان'' کے مفہوم کو ٹٹولو کہ وہ کیا ہے؟ یہ کہنا پڑے گا کہ (حیوان ایک جسم ہے نامیؔ، حساسؔ، متحرکؔ بالارادہ) یہ حیوان کی تعریف ہوئی اس میں جزا عظم یا جنس جسم ہے اور نامی حاس اور متحرک بالارادہ فصلیں ہیں انہیں چھوڑ کے جسم کو دیکھو کہ وہ کیا ہے؟ یہی کہو گے کہ (جسم ایک چیز ہے جس میں العباد ثلثہ ہیں) یہ جسم کی تعریف ہوئی۔ العباد ثلثہ سے مراد ہے طولؔ عرض عمقؔ اس سے نیچے اُترنا مجھے مناسب معلوم نہیں ہوتا کیونکہ اگر کچھ اور بھی نیچے اُتریں تو عناصر کی اور جوہر کی بحث پیش آجاتی ہے اور یہی کہنا پڑتا ہے کہ کچھ ہے تو لیکن عقل سے صاف صاف معلوم نہیں ہو سکتا۔ امکانی خیالات کے ڈھیر لگ جاتے ہیں جن سے صرف حیرانی پیدا ہوتی ہے اور حقیقی بات انسانی فہم سے پیدا نہیں ہوتی ہے۔ یہ مقام ایک ورطہ یا گرداب ہے جس میں بہت لوگ ڈوب مرے ہیں اور گوہر مراد پا کے کوئی غوطہ زن نہیں نکلا۔ یہ خوف خطرہ کا مقام ہے اسی جگہ پر کھڑے ہو کے کسی نے کہا کہ ہمہ اُوست ہے اور کسی نے کہا نہیں ہمہ از اُوست ہے۔ پہلا خیال زہر قاتل اور دوسرا خیال تریاق ہے جو اسی جگہ سے آدمی نکالتے ہیں۔ لہٰذا اس بحث کو طول دینا بے فائدہ درد سری ہے۔

ہم جو عیسائی (مسیحی) ہیں اس مقام پر اُس انبیائے قول کو مضبوطی سے تھام لیتے ہیں کہ خُدائے قادر نے مادہ کو بے مادہ صرف اپنے حکم کی تاثیر سے موجود کیا اور مادہ کا مادہ گویا وہ حکم الٰہی تھا کہ اُس نے کہا ہو جا اور ہو گیا کچھ نہ تھا اور سب کچھ ہو گیا۔

دیکھو نیچے کی طرف اُترنے میں تنزل پر تنزل چلا آتا ہے اور تمام تنزلات کے نیچے یہی آتا ہے کہ کچھ نہ تھا۔ تو بھی اب ہم سب کچھ موجود دیکھتے ہیں اور کلام اس میں باقی رہتا ہے کہ یہ سب کچھ کہاں سے اور کیونکر ہو گیا؟ ''کہاں'' سے کا جواب تو ہمارے پاس صرف یہی ہے کہ نیستی سے نکلا جو انسانی خیال میں محال ہے مگر وہ فطری نور جو خُدا نے ہم میں رکھا ہے یہ دکھاتا ہے کہ خُدا کی قوت کے سامنے محال نہیں ہے اور لفظ '' کیونکر'' کا جواب یہ ہے کہ قادر کی قدرت سے ہوا۔ اُس کی قدرت کے سامنے بہت سی وہ باتیں جنہیں ہم محال کہتے ہیں محال نہیں ہیں۔

پس میں جسم ہی پر اس بحث کو چھوڑتا ہوں اور یوں کہتا ہوں کہ اس طرف تحقیقات عقلیہ کا ور وازہ بند ہے اور جو جو کچھ اہل خیال بولتے ہیں وہ اُن کی امکانی تجویزیں ہیں۔ پس چاہئے کہ ہم اس خیالی غار میں سے نکلیں اور اپنی ماہیت کے مفہوم میں اوپر کی طرف چڑھیں جہاں تک چڑھ سکتے ہیں اور خوب ٹٹولیں کہ ہمارے وجود میں کیا کچھ ہے اور کہاں تک ہمیں امید ہے؟ پس معلوم ہو جائے کہ ہم سب جسم مطلق میں شامل ہو کے ٹھوس بے جان پتھروں اور اینٹوں اور خاک کے ہم جنس یا ہم رتبہ یار شتہ دار ہیں۔ خُدائے قادر ہمیں ایک خاص شکل میں لایا اور اُس نے قدرتی تصرف سے ہم میں قوت نامیہ جس سے بڑھتے اور نشو و نما کی شادابی حاصل کرتے ہیں پیدا کی۔ تب ہم جمادات کے درمیان ممتاز ہوئے اور درختوں میں شامل ہو گئے اور جمادات ہمارے نیچے آئے تو بھی حیوانات اوپر رہے۔

یہ قوت نامیہ ہم میں کہاں سے آگئی کیا صرف جمادات میں سے نکلی ہر گز نہیں بلکہ یہ ہوا کہ ہماری جمودیت کو کوئی خارجی قوت ترتیب خاص میں لائی اور مادہ کے درمیان سے نمی اور ہوا اور دھوپ نے اُسی ترتیب میں تاثیر کی اور اُس خارجی قوت کی مرضی اور ارادہ کے موافق ایک خاص قوت ہم میں موجود ہو گئی جس کو قوت نامیہ کہتے ہیں۔ اس قوت کے سبب سے ہم نباتات کی جنس میں شامل ہو گئے اور جسم نامی ٹھہرے۔ ''جسم نامی'' کے معنی ہیں وہ جسم جس میں نمو کی قوت ہے پھر بھی بے حس و حرکت تھے صرف نمو کی شان آگئی تھی۔

اس کے اوپر ایک اور چیز جس کو ''حیات'' کہتے ہیں اور اُسی کا نام فارسی میں ''جان'' ہے ہم میں آگئی جس کے سبب سے ہم حساس اور متحرک بالارادہ ہو گئے اور نباتات کی برادری میں سے نکلتے حیوانات میں شامل ہوئے۔

''حیات'' کے معنی ہیں '' زندگی''۔ حیوان وہ ہے جس میں حیات ہے۔ ''حساس'' کے معنی ہیں '' حِسّوں والا'' اور ''متحرک بالارادہ'' وہ ہے جو اپنے ارادہ سے حرکت کرتا ہے۔ یہ دونوں باتیں یعنی حِسّوں والا ہونا اور حرکت کنندہ ہونا حیات کو لازم ہیں۔ یہ حیات یا جان حیوانوں میں کہاں سے اور کیونکر آگئی ہے؟ ظاہر تو ہے کہ عنصروں کی خاص ترتیب سے نکلی ہے تو بھی اُس قوت خارجی کا جو جہاں میں ہر کہیں موثر نظر آتی ہے اس حیات کے ایجاد میں صاف صاف دخل معلوم ہوتا ہے کیونکہ حیوان کی جان اور اُس کے جسم پر غور کرنے سے اور اُس کے خصائص کے دیکھنے سے موجد کے آثارِ ارادہ اُس میں نظر آتے ہیں اور وہ ارادے ہر جانور کی زندگی میں پورے بھی ہوتے ہیں۔

البتہ حیوانات کی جانوں میں ادراک اور تعقل نہیں ہے۔ صرف زیست کے بحال رکھنے کا اور تلاش معیشت کا تھوڑا سا شعور فطری ہے جس کو عقل حیوانی کہنا چاہئے اور وہاں تک انسان بھی حیوانوں کے برابر رہتے ہیں۔

حیوانوں میں سے ایک قسم کا حیوان انسان ہے اور اُس میں ایک خاص چیز ایسی دکھائی دیتی ہے جو اور حیوانوں میں نہیں ہے۔ اُس چیز کو اہل علم ''نطق'' کہتے ہیں۔ یہ کوئی اور ہی چیز ہے جو اُس حیوان یعنی انسان کی جان کے اوپر کہیں سے اُس میں آگئی ہے اور اسی چیز کے سبب سے یہ دیگر حیوانوں میں ممتاز ہوا ہے اور اُن میں سے نکل کے اعلیٰ رتبہ کا پہنچا ہے اور اُس کی تعریف حیوان ناطق ٹھہری ہے۔

دیکھو ہمارا نچلا حصہ خاک ہے اور اُس کے اوپر نمو ہے اور نمو کے اوپر جان ہے اور جان کے اوپر نطق ہے اور یہ ہمارا اوپر کا حصہ ہے یہ سب کچھ تو صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا خالق ہمیں ترقی دیتا ہوا کہاں سے کہاں لایا ہے؟ اب کون کہہ سکتا ہے کہ آگے کو ترقی کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔ شاید ہم اور بھی ترقی کرتے کرتے خالق کی حضوری میں پہنچیں گے اور خاک سے افلاک پر چڑھیں گے یا اسفل السافلیں میں گریں گے۔

دفعہ ۱۳

نطق کے بیان میں

اب ''نطق'' کی طرف دیکھئے کہ وہ کیا چیز ہے؟ عربی زبان میں ''نطق'' کے معنی ہیں ''بولنا'' لیکن اصطلاح میں صرف ''بولنا'' ہی نہیں بلکہ ادراکِ معنی کی بھی اُس میں شرط ہے اور اس صورت میں ''نطق'' نام ہوا اُس قوت کا جو ادراک معنی کی قوت انسان میں ہے اور اسی قوت کے لحاظ سے انسان کی رُوح کو ''نفس ناطقہ'' کہتے ہیں۔

جب کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص کا نفس ناطقہ یا بولتا نکل گیا تو یہ مراد ہے کہ اُس کی رُوح نکل گئی۔ لفظ'' نفس'' کے معنی ہیں'' حقیقت شے''۔ ''انسانی نفس'' سے مراد ہے انسانی حقیقت یعنی وہ اصلی چیز جو انساں میں ہے۔

اُس کا دوسرا نام'' رُوح'' ہے۔ لطافت کے سبب سے اس وقت یہ معلوم ہو جائے کہ وہ حقیقتِ انسان جس کو'' نفس انسان'' کہتے ہیں وہ ایک ہی چیز ہے اور اُس کے نام چھ ہیں۔ بلحاظ اُس کی چھ صفتوں کے قوتِ ادراک کے لحاظ سے اُس کو ''نفسِ ناطقہ'' کہتے ہیں کیونکہ اُس میں ادراک کی قوت ہے۔ اور جب وہ نفس دنیاوی لذتوں کی طرف بشدت مائل ہوتا ہے تو اُس صورت میں اُس کو'' نفس امارہ'' کہتے ہیں۔ اور جب وہ نفس اپنی بد کرداری سے پچھتاتا ہے اور شرمسار ہوتا ہے اُس کا نام ''نفسِ لوّامہ'' ہوتا ہے اور جب وہ خُدا سے مغفرت اور تسلی حاصل کر کے خوشی میں ہوتا ہے اُس وقت اُس کو ''نفسِ مُطمئنّہ'' کہتے ہیں اور جب اس پر ہدایت غیبی کے انوار الٰہی فیضان سے نازل ہوتے ہیں یا اُس پر چمکتے ہیں تب اُس کا نام ''نفس ملہمہ'' ہوتا ہے اور لطافت کے لحاظ سے ہر کوئی اُسے رُوح کہتا ہے۔ پس چیز ایک ہی ہے نام چھ ہیں۔

یہ حقیقت انسان یعنی رُوح جس میں یہ چھ کیفیتیں ہیں اور جس کے سبب سے انسان ارضی مخلوقات میں اشرف نظر آتا ہے۔ تمیزی ادراک کہتا ہے کہ وہ حیوانی جان کے اوپر کوئی شے ہے لیکن اُس کی ماہیت کہ وہ کیا ہے؟ عقل انسانی سے پوری پوری دریافت نہیں ہو سکتی ہے۔ مگر بائبل شریف نے اس بارے میں ہماری تسلی کر دی ہے یہ دِکھا کے کہ یہ ''نفس ناطقہ'' یا ''رُوح'' عالم بالا کا ایک شخص ہے اور مخلوق ہے جسے خُدا نے پیدا کیا اور انسان کے بدن میں اُسکی جان کے اوپر رکھا ہے۔ اُسی کا نام کلام اللہ میں ''زندگی کا دم'' ہے جو خُدا نے آدم میں پھونکا یعنی پیدا کیا گیا تھا۔ پس ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ یہ نفس ناطقہ جو انسان میں ہے مثلِ نمو اور حیات کے ترکیب عناصر کا حاصل نہیں ہے بلکہ عالم علوی کا ایک جوہر بڑا شریف اور بیش قیمت ہے۔

دفعہ ۱۴

جان اور رُوح کا بیان

لفظ ''رُوح'' کے معنی ہیں '' ہوا'' لیکن نہ وہ ''ہوا'' جو ہمارے چاروں طرف بہتی ہے کیونکہ آدمی کی رُوح میں کچھ کیفیت ہے جو عام ہوا میں نہیں ہے تو بھی اس عام ہوا کے ساتھ اُس کی رُوح کا کچھ علاقہ ہے۔ لطافت اور سکونت کے لحاظ سے چنانچہ اگر کسی مکان میں خلا کر دیا جائے اور ہوا کھینچ لی جائے تو وہاں کوئی جانور اور انسان جی نہیں سکتا، فوراً جان نکل جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نہیں ہو سکتا کہ رُوح انسانی محض '' ہوا'' ہے بلکہ یہ بات ہے کہ گویا رُوح ''ہوا'' پر سوار ہے اور ''ہوا'' اس کا مسکن سا ہے جب ''ہوا'' پہنچے گی تو رُوح کے لئے مسکن نہ رہا اس لئے وہ غائب ہو جاتی ہے اور کہیں چلی جاتی ہے ہوا میں رَل مل بھی نہیں جاتی۔

لفظ '' رُوح'' کے اصطلاحی معنوں میں اور اس کی ماہیت کے بیان میں اہل علم میں آج تک بہت سا اختلاف کیا ہے اور ان لوگوں کا سارا بیان پڑھنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ رُوح کی ماہیت آدمیوں کو اب تک معلوم نہیں ہوئی ہے۔ ہاں یہ بات تو خوب معلوم ہے کہ انسان میں مثل سب حیوانات کے ایک حرارت ہے جس کو یہ حکیم ''حرارت غریزی'' کہتے ہیں۔ '' غریزہ'' نام ہے ''سرشت یا طبیعت '' کا اور سرشتی حرارت جو عناصر کی آمیزش سے پیدا ہوتی ہے وہی ''حرارت غریزی یا سرشتی'' ہے۔

یہ حرارت قلب میں کہ گوشت کے ٹکرا سے پیدا ہوتی ہے اور نسوں کے وسیلہ سے سارے بدن میں پھلتی ہے۔ اسی کو طبیب لوگ ''رُوح حیوانی'' کہتے ہیں اور بیماری کی حالت میں اسی کے سنبھالنے کی کوشش ہوتی ہے کیونکہ ہر جاندار کی زندگی اُسی پر موقوف ہے اور اُس کا نام جان ہے جس کے سبب سے سب حیوان ''جانور'' یعنی '' جان والے'' کہلاتے ہیں۔ لیکن یہ جسمانی ہے اور جسم کے ساتھ فنا ہو جاتی ہے۔ اُس کو کوئی حکیم '' ہوائی جسم '' کہتا ہے اور کوئی '' آتشی'' اور کوئی '' آبی'' بتاتا ہے اور یہاں تک انسان میں اور سب حیوانات میں مساوات رہتی ہے۔ اور جب کہا جاتا ہے کہ انسان میں دو چیزیں ہیں یعنی رُوح اور جسم تو جسم کی غایت اُس کے اعضائے کثیفہ سے لے کے اُس کی ایسی جان تک مراد ہوتی ہے یعنی جسم کی حد میں یہ جان بھی آجاتی ہے اور رُوح سے مراد وہ چیز ہوتی ہے جو حد جسمانی سے باہر ہے۔

خُداوند یسوع مسیح کی نسبت اتھناسیس کے عقائد نامہ میں لکھا ہے (فقرہ ۳۷) کامل خدا کامل انسان نفس ناطقہ اور انسانی جسم کی ترکیب میں موجود۔ یہاں لفظ جسم میں یہ حیوانی جان بھی شامل ہے۔

اس جان میں بھی کسی قدر شعور معیشت کی روشنی خالق سے ڈالی ہوئی نظر آتی ہے لیکن وہ شعور ہے نہ عقل۔ جانور اس شعور محدود کے وسیلہ سے دنیا میں گزارہ کرتے ہیں اور معمولی طریقہ میں اُس سے کام لیتے ہیں۔ نہ اُس میں ترقی کر سکتے ہیں نہ اسے اشکالِ متنوعہ میں استعمال کر سکتے ہیں۔ پس وہ ایک خاص حد میں رہتے ہیں۔

آدمی میں اس جان کے اوپر کوئی اور چیز ہے اور وہ صرف انسان ہی میں پائی جاتی ہے اور وہی فصل ہے جو کہ انسان کو حیوان مطلق میں سے نکالتی ہے۔ جمادات میں سے نکالنے کے لئے نمو فصل تھا اور نباتات میں سے نکالنے کے لئے یہ جان فصل ہوئی تھی۔ اب حیوانات میں سے نکالنے کے لئے یہ چیز فصل ہے جس کو ''نفس ناطقہ'' کہتے ہیں۔

یہ رُوح کیا چیز ہے؟ کوئی کہتا ہے کہ وہ ایک نور ہے اُس میں تعقل اور ادراک ہے اور حرکت وارادہ کی استعداد ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ وہ کوئی شے قدیم ہے لیکن ایسا بولنے والا کچھ ثبوت نہیں دے سکتا۔ کوئی کہتا ہے کہ وہ حادث (نئی چیز جو پہلے نہ ہو۔ فانی) ہے لیکن غیر فانی ہے خالق نے اُسے ابد تک زندہ رکھنے کے لئے پیدا کیا ہے۔ اُس کے لئے ابتدا تو ہے لیکن انتہا نہیں ہے۔ ایسا بندوبست خالق نے اس کے لئے کیا ہے۔ ہمارا بھی رُوح کی نسبت ایسا ہی یقین ہے اور یہی خیال سب پیغمبروں کا تھا اور ثبوت اس خیال کا اسی رُوح کی صفتوں میں سے نکلتا ہے۔ بعض اہل فکر نے کہا ہے کہ یہ رُوح عالم تجرد کا ایک شخص ہے جو خاکی بدن میں رہتا ہے جیسے جسمانی اعضا بدن میں ہیں ویسے ہی رُوح میں بھی اعضا ہیں۔ لیکن یہ خیال صوفیہ کا ہے اور اُس کا ثبوت کچھ نہیں ہے۔ کلام اللہ میں اس رُوح کو ''باطنی انسان'' کہا گیا ہے۔ ''۔۔۔ گو ہماری ظاہری انسانیت زائل ہوتی جاتی ہے پھر بھی ہماری باطنی انسانیت روز بروز نئی ہوتی جاتی ہے'' (۲۔ کرنتھیوں ۴:۱۶)۔ ''کیونکہ باطنی انسانیت کی رُو سے تو میں خُدا کی شریعت کو بہت پسند کرتا ہوں'' (رومیوں ۷:۲۲)۔ اِسی باطنی انسانیت کے ذمہ افعال کی جوابدہی ہے۔ سارے پیغمبر اس بات پر زور لگا رہے ہیں کہ یہ باطنی انسان ابدی دکھوں سے بچایا جائے۔ اسی کی اصلاح کے لئے مسیح خُداوند مجسم ہو کے دنیا میں آیا اور مصلوب ہوا، مر گیا، دفن ہوا، تیسرے دن جی اُٹھا اور اپنی اس بیش قیمت موت اور حیات کی تاثیروں سے وہ ہمارے اس باطنی انسان کو نیا بناتا ہے (افسیوں ۲:۵؛ ۴:۲۴) اور یہی باطنی انسان ہے جو خُدا کی قربت اور رفاقت حاصل کرتا ہے اور یہ ہر انسان کی جان یا رُوح حیوانی پر سوار سا ہے لیکن اس کا جلال دماغ میں زیادہ ظاہر ہے۔

دفعہ ۱۵

رُوح اور جان کی زیادہ توضیح

ایک فارسی شاعر نے یوں کہا ہے اور بہت خوب کہا ہے اُس پر خوب غور کیجئے۔

آدمی زادہ طرفہ معجونی ست — از فرشتہ سرشتہ وز حیوان

گر کند میل این شود بدزیں — در کند میل آن شود بہ زاں

اس جگہ لفظ ''فرشتہ'' سے مراد ''فرستہ'' یعنی ''فرستادہ'' ہے جو خُدا سے بھیجا گیا یا پیدا ہوا ہے یعنی رُوح جسے خُدا نے انسان میں پھونکا کہ اس خاکی بدن میں کچھ عرصہ تک رہے اور کچھ خاص کام کرے۔ لفظ ''سرشتہ'' جو ''سرشتن'' مصدر سے ہے اس میل ملاپ کا بیاں کرتا ہے جو اُس فرشتہ کو رُوح حیوانی سے ہوا ہے۔ گویا اُس کے ساتھ گوندھا گیا ہے اور اس ترکیب سے جو پیدا ہوا ہے وہی آدمی زادہ ہے۔ اُس میں دو میلان صاف نظر آتے ہیں جن میں سخت مخالفت ہے۔ جسم کی خواہش رُوح کے مخالف ہے اور رُوح کی خواہش جسم کے مخالف ہے (گلتیوں ۵:۱۷) اور اس مرکب شخص کا اپنا اختیار

ہے۔جدھر چاہے زیادہ متوجہ ہو وہ کسی تقدیر کا مجبور نہیں ہے۔اگر وہ حیوانیت کی طرف مائل ہوتا ہے جیسے کہ سب نفس پرور اور عیاش اور دنیا کے مغلوب لوگ ہیں تو حیوان سے زیادہ ذلیل اور خوار ہے کیونکہ حیوان سے زیادہ عزت دار چیز اُس میں تھی یعنی رُوح اور اگر وہ فرشتہ کی طرف مائل ہوتا ہے یعنی رُوحانی خواہشوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو دیگر آسمانی فرشتوں سے زیادہ رتبہ پاتا ہے کیونکہ اُس نے وہ بہادری کی جو اور فرشتوں نے نہیں کی ہے۔ اُن میں کچھ حیوانیت نہ تھی،اس میں تھی پھر بھی یہ غالب آیا اور بہادر نکلا۔اب ناظرین سوچیں کہ یہ بیان سچ ہے یا نہیں؟اگر سچ ہے تو فکر کرو کہ آپ لوگ کیسے ہیں؟آپ کے مزاج شریف کس طرف مائل ہیں؟آپ حیوان سے بدتر ہیں یا فرشتوں سے اچھے ہیں مرنے سے پہلے ابھی فیصلہ کر لیجئے۔

یاد رہے کہ مقربان (مقرب کی جمع۔دوست،ہمراز) درگاہ الٰہی کی بھی شناخت ہے کہ اُن کی سفلیت (پستی) پر اُن کی علویت (بلندی) غالب آتی ہے اور بُرے آدمی اسی لئے بُرے ہیں کہ وہ سفلیت کے مغلوب ہیں عُلویت کی طرف متوجہ نہیں ہوتے بلکہ ایسے خیالوں کو ٹھٹھہ میں اڑاتے ہیں۔

سفلیت اُس وقت غالب آتی ہے جب آدمی اپنی روحانی قوتوں اور خواہشوں کا کام چھوڑ دیتا ہے اور سفلی قوتوں اور خواہشوں کو کام میں لاتا ہے۔ اگر کوئی چاہے کہ میں اپنی سفلیت پر غالب آؤں تو چاہئے کہ وہ اپنی ساری طاقت سے اس بارے میں ساعی (کوشش) ہو اور خُدا سے مدد مانگے وہ اُسے طاقت بخشے گا۔

دفعہ ۱۶

نفس ناطقہ میں کچھ علوی کرنیں چمکتی ہیں

اس شاعر نے ''نفس ناطقہ'' کو'' فرشتہ'' بتایا ہے۔حکما اُسے ''فطری نور'' کہتے ہیں۔کلام اللہ میں اُس کو'' زندگی کا دم'' کہا گیا ہے۔لیکن بعض آدمی جو بے ایمان ہیں اُس کو ترکیب امتزاجی کی کیفیت کا حاصل بتاتے ہیں۔یہ خیال ذلیل ہے اور بے فکری کا خیال ہے یا غلط مقدمات کا غلط نتیجہ ہے اور آدمی کی زندگی کے دائرہ کو خراب کر ڈالتا ہے۔وہ جو کہتے ہیں کہ نفس ناطقہ ترکیب امتزاجی کا حاصل ہے اُن کی دلیلیں یہ ہیں کہ ترکیب امتزاجی کی بربادی کے ساتھ نفس ناطقہ بھی برباد ہو جاتا ہے اور کہ جسمانی قوت کی ترقی سے اُس میں ترقی اور تنزل سے تنزل ہوتا ہے اس لئے ترکیب مذکورہ کا حاصل ہے۔

میں کہتا ہوں کہ کوئی مرکب شئے اپنے اجزا کی کیفیت سے الگ کوئی صفت پیدا نہیں کر سکتی ہے۔ترکیب امتزاجی کے اجزا عناصر ہیں اور عناصر میں ادراک وارادہ کی استعداد بھی نہیں ہے۔پس جو چیز اجزا میں مطلق نہیں ہے وہ ترکیب میں کہاں سے نکل سکتی ہے۔رُوح حیوانی یا جان ضرور ترکیب عناصر کا حاصل ہے تو بھی بتایئے کہ اُس میں حساسی اور تحرک کون سی جز کی خاصیت ہے۔وہ تو ایک روشنی سے ہے جو خارج سے اُس میں آئی ہے۔اسی طرح رُوح انسانی کی نہ بعض بلکہ تمام خصلیتں ایسی ہیں کہ مادہ سے کچھ بھی لگاؤ نہیں دکھاتیں۔البتہ انسان کے مزاج میں اجزا مادہ کی تاثیرات دکھائی دیتی ہیں۔لیکن نفس ناطقہ میں کچھ اور ہی معاملہ نظر آتا ہے۔خیالات ذیل پر غور کیجئے۔

۱۔ مدارج اور مناصب عُلیا (اعلیٰ مرتبے) کے حاصل کرنے کی ایک خاص اِستعداد سب آدمیوں کی رُوحوں میں موجود ہے جس سے بعض آدمیوں نے حسب کوشش ہر ہر کام میں تعجب کی لائق ترقی بھی دکھائی ہے ایسی استعداد نہ کسی ارضی مخلوق میں ہے نہ رُوح حیوانی میں ہے نہ مادہ کے مناسب ہے۔ پھر یہ استعداد نفس ناطقہ میں کہاں سے ہے ؟اب اس استعداد کی بنیاد یا تو مادہ میں سے نکالو یا مان لو کہ نفس ناطقہ کسی غیر جہان کا شخص ہے۔

۲۔ سب حیوانوں کی طرف دیکھو صرف سفلی اور جسمانی صفات اُن میں ہیں۔ ہاں اتنی بات اُن میں ہے کہ حساسی اور تحرک اور کسی قدر معیشت کا ناقص سا شعور رکھتے ہیں اور میں اس کو بھی بالائی چمک کہتا ہوں۔ باقی تمام صفتیں جو اُن کی جانوں میں ہیں سفلی ہیں کیونکہ اُن میں صرف وہی جان ہے جو ترکیب امتزاجی سے پیدا ہوئی ہے اور یہ ترکیب مادہ سے ہے اور مادہ اپنی تاثیریں مسلمہ اُن میں دکھا رہا ہے۔ لیکن انسانی رُوح میں علویت کی خواہش کہاں سے ہے ؟

۳۔ حیوانات کی جانوں میں جو خواہشیں ہیں وہ سب اسی زمین کی چیزوں سے پوری ہو جاتی ہیں اور تکمیل پاتی ہیں اور جانور اپنی خوشی اسی جہان میں پوری کر لیتے ہیں۔ لیکن انسان کی رُوح میں جو خواہشیں ہیں وہ اس جہان کی چیزوں سے آسودہ اور مکمل نہیں ہو سکتی ہیں۔ اس کا یہی سبب ہو سکتا ہے کہ نفس ناطقہ عالم بالا کا شخص ہے اور اپنے دیس کی چیزوں سے جو اُس کی طبع کے مناسب ہیں وہ آسودہ اور خوش ہوتا ہے کیونکہ ہر چیز کا میلان اُس کے کرہ کی طرف ہوتا ہے۔

مثلاً آدمی کی رُوح ابدی بقا اور حقیقی خوشی کی یقیناً طالب ہے اور یہ دونوں چیزیں یعنی ابدیت اور حقیقی خوشی اس دنیا میں کہاں ہیں ؟ہم تو سب مرنے والے ہیں نہ آگے کوئی رہا ہے نہ ہم رہیں گے۔ پھر وہ ابدی بقا کہاں ہے ؟ جس کی یہ رُوح طالب ہے اور یہاں جو خوشی ہے وہ فانی اور تلخی آمیز ہے۔ پس حقیقی خوشی دنیا میں کہاں ہے جس کی طالب رُوح ہے ؟ پھر فرمائیے کہ رُوح انسانی کے درمیان ان دونوں چیزوں کی اُمنگ کیونکر پیدا ہو گئی ہے ؟ ہم نہیں کہہ سکتے کہ انسانی روح دیوانی ہے یا اُسے وہم ہو گیا ہے کیونکہ یہ امنگ اُس میں طبعی ہے نہ عارضی۔ اس لئے ہم کہتے ہیں کہ وہ علوی ہے اور عالم بالا میں حقیقی خوشی اور ابدیت کے وجود کی خبر ہماری تمیز بھی ہمیں دیتی ہے۔ پس رُوح وہ چیزیں مانگتی ہے جو دنیا میں نہیں ہیں لیکن اللہ میں ہیں اور اس کا سبب یہی ہے کہ رُوح انسانی اللہ کی طرف سے ہے، مادہ سے پیدا نہیں ہوئی ہے۔ ناظرین بہت فکر کریں اور گمراہ نہ ہوں۔ نفس پروروں کی واہیات باتوں میں پھنس کے اپنی روحوں کو برباد نہ کریں۔

۴۔ عام اور خاص آدمیوں میں سے اُن آدمیوں کی رُوحیں جنہیں اس جہان کے غبار نے دبا کے بالکل اندھا نہیں کر دیا ہے بلکہ اُن کی آنکھیں کچھ ٹمٹماتی ہیں۔ وہ سب اپنے ضروری فائدہ کے لئے بوسیلہ نیک اعمال کے یا ریاضت بدنی اور ایمان واعتقاد کے کچھ ثواب جمع کرتے ہیں۔ ہندو، مسلمان، یہودی اور عیسائی وغیرہ تمام اہل مذاہب یہی کچھ کرتے ہیں۔ یہ بحث جدا ہے کہ کون مناسب اور کون نامناسب مشقت کھینچتا ہے لیکن کچھ نہ کچھ مشقت یہ سب کھینچتے ہیں اس امید پر کہ بعد انتقال خُدا سے کچھ پائینگے اور کیا پائینگے وہی ابدی بقا اور خوشی مانگتے ہیں۔

لامذہبوں، تعلیم یافتوں کی اخلاقی و تہذیبی کوششیں بھی کچھ ایسے ہی مطلب پر معلوم ہوتی ہیں۔ کیوں ان سب کی رُوحیں آئندہ دکھوں سے تھرتھراتی ہیں ؟ کیوں ان رُوحوں میں ایسا یقین ہے کہ بعد فنا اس ترکیب بدنی کے ہم باقی رہیں گے اور وہ کیوں کسی نہ کسی وسیلہ سے چھٹکارے اور آرام کے امیدوار ہیں۔ سب حیوانوں کی ایسی کیفیت کیوں نہیں ہے ؟ صرف آدمیوں ہی کی ایسی کیفیت کیوں ہے ؟ اسی لئے کہ حیوانی رُوح فانی اور مادہ کی ترکیب سے ہے اور اُس میں ادراک نہیں۔ انسانی رُوح غیر فانی اور عالم بالا سے ہے اور اُس میں ادراک ہے اور وہ اس جہان میں آپ کو مسافر سمجھتی ہے اور بعد انتقال آپ کو شے باقی جانتی ہے اور جہاں جا کے باقی رہنا ہے اُسے اپنا گھر اور دیس سمجھتی ہے اور یہ رُوح کا خیال طبعی ہے اور درست ہے۔

دفعہ ۱۷

ایک فائدہ ہے یاد رکھنے کے لائق

چند آدمی سقیم (بیمار۔ خستہ) الارواح یا مغلوب دنیا یا بہایم سیرت یا وہمی لوگ یا کج فہم یا بے ایمان کہ بے راہ روی کر کے ناامیدی اور نادانی کے غار میں جا پڑے ہیں۔ اگرچہ وہ بظاہر خوش پوشاک اور خوش خوراک بلکہ خوش اخلاق اور تعلیم یافتہ اور صاحب مدارج کیوں نہ ہوں لیکن اُن کے دلوں اور خیالوں کی وہی کیفیت ہے جو اوپر کے سخت لفظوں میں پردہ ہٹا کے میں نے سنائی یاد کھائی ہے (اگر مرضی ہو تو غور کر کے اُن کی طرف تاکنا کہ وہ ایسے ہی ہیں یا نہیں)۔ ایسے لوگوں نے آئندہ کی امید کو اپنے دلوں اور خیالوں میں سے زبردستی کھینچ کھینچ کر نکالا ہے اور حیوانوں کے ساتھ اسی جہان میں برباد ہونے کے شوقین ہوئے ہیں۔ ان کی رُوحوں میں کیفیت مذکورہ بالا کا نہ ہونا رُوح انسانی کی فطری حالت کا بیان نہیں ہو سکتا ہے کیونکہ اُن میں کسی انحطاط کا ظہور ہے اور رُوح کی فطری کیفیت وہی ہے جو جمِ غیفر کی رُوحوں میں پائی جاتی ہے۔

اور میں اس بات پر بھی توجہ نہیں کرتا جو وہ لوگ کہتے ہیں کہ وحشی آدمیوں کی رُوحوں میں ایسی علوی کرنیں کیوں نہیں چمکتی ہیں جیسی تم مذہبی تعلیم یافتوں کی رُوحوں میں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہاں کچھ تو ہے جو بہت غور سے نظر آتا ہے مگر آپ لوگ علمی روشنی اور آسائش کے ملکوں اور مکانوں میں آرام سے بیٹھے ہوئے اُن وحشیوں کے حق میں دور سے جو چاہتے ہو سو کہتے ہو، ذرا اُن کے نزدیک جانا اور اُن کے محاورات دوستورات میں مشق کر کے اُن کی کیفیت سے آگاہ ہونا جیسے ہمارے بھائی مشنری لوگ کرتے ہیں۔ تب معلوم ہو گا کہ اُن کی رُوحوں میں بھی ایسی ہی استعداد اور طلب ہے۔

اور یہ کہنا کہ ہماری رُوحوں کی ایسی کیفیت تعلیم کے سبب سے ہے نہ کہ رُوح کی طبع کے اس لئے جائز نہیں ہے کہ تعلیمی دستور صانع (کاریگر۔ خالق) نے انسان کی فطرت میں رکھا ہے۔ اگر آدمی کا بچہ تعلیم نہ پائے تو وہ کچھ نہیں سیکھتا۔ پیدا ہوتے ہی بچہ کی تعلیم والدین سے شروع ہوتی ہے۔ وہ سکھاتے ہیں کہ دودھ یوں پینا چاہئے، یہ باپ ہے، یہ ماں ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہاں تک کہ والدہ کی چھاتیوں سے شروع کر کے بڑھاپے کی موت تک انسان سیکھتا اور تعلیم پاتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ مر جاتا ہے اور تعلیم تمام نہیں ہوتی ہے۔ پس تعلیم انسان کے لئے کوئی عارضی امر نہیں ہے بلکہ اس کے کمال کا طریقہ اور امر فطری ہے۔ جو کوئی تعلیم سے محروم ہے خواہ وحشی ہو یا شہری وہ اپنے کمال کے طریقہ سے گرا ہوا ہے۔ پس اُس کی رُوح کی طرف دیکھ کے ہم ایسا حکم نہیں دے سکتے کہ خصائص مذکورہ امور فطری نہیں ہیں کیونکہ ایسا قیاس غلط ہے۔ ہم کو چاہئے کہ انسان کامل کی طرف دیکھیں اور وہاں سے رُوح کی شان دریافت کریں نہ کہ بچوں، وحشیوں، سقیم الارواح ملحدوں (بے دین)، بد تعلیم یافتوں، احمق، جاہلوں اور جوگیوں وغیرہ کی طرف دیکھ کے نیچے گریں۔ ہم تو ترقی کرتے چلے آئے ہیں اور بھی زیادہ ترقی کرینگے۔ تعلیم کو فطری طریقہ سمجھیں گے اور سب تعلیموں پر غور کر کے عمدہ تعلیم کے پابند ہوں گے اور اس طریقہ سے صیقل شدہ (صاف شفاف) ارواح میں رُوحوں کے جوہر دریافت کریں گے اور کہیں گے کہ تمام ارواح بنی آدم میں ایسے ایسے جوہر ہیں جو علویت دکھاتے ہیں اور یوں انسان کی رُوح کا علوی جوہر ہونا ثابت ہے۔

دیکھو درخت اپنے پھلوں سے پہچانا جاتا ہے کہ وہ اچھا اور مفید درخت ہے یا بُرا اور مضر۔ لیکن کچے اور ہوا سے ٹوٹے اور گر کے سوکھے پھلوں سے ہم پوری شناخت درخت کی حاصل نہیں کر سکتے ہیں بلکہ کامل اور پختہ پھلوں سے جو مناسب وقت پر درخت سے اُترتے ہیں درخت پہچانا جاتا ہے۔

پس رُوح انسانی کے جوہر کامل آدمیوں میں دیکھنا چاہئے، وحشیوں اور شریروں اور بچوں میں جو ناکامل ہیں اور درخت انسانیت کے کچے یا گرے اور سوکھے پھل ہیں کیا دریافت کر سکتے ہو؟ تو بھی جو کچھ اُن میں نظر آتا ہے وہی ہمارے مطلب پر مفید ہے۔ ناظرین کو چاہئے کہ ملحدوں کے بہکانے سے گمراہ نہ ہوں مگر خود کامل ہونے کی کوشش کریں اور کامل شخصوں کی طرف دیکھیں۔

دفعہ ۱۸

انسانی حواس عشرہ کے بیان میں

''حواس''جمع ہے ''حاسہ'' کی اُس کے معنی ہیں ''دریافت کرنے کی قوت''۔انسان میں پانچ حواس ظاہری صاف نظر آتے ہیں لیکن حکیم کہتے ہیں کہ پانچ حواس باطنی بھی ہیں۔ قدیم محمدی ان پانچ حواس باطنی کے قائل نہیں ہیں۔ لیکن ہم اگر اُن کے بھی قائل ہوں تو کچھ مضائقہ نہیں ہے۔ پس میں اس مقام پر ظاہری اور باطنی حواس کو ملا کے دس حواس کا ذکر کرتا ہوں۔ **انسانی رُوح بوسیلہ ان حواس عشرہ کے اس جہان کی چیزوں کو دریافت کیا کرتی ہے** اور جو کچھ دریافت کرتی ہے بموجب اُس کے تجویزیں اور ارادے اور بندوبست باندھتی ہے اور اپنے بدنی اعضا کو ہلاتی اور کام بھی کرتی ہے۔ حواس خمسہ ظاہری یہ ہیں '' قوتِ لامسہ''، ''قوتِ باصرہ''، ''قوتِ سامعہ''، '' قوتِ ذائقہ''، '' قوتِ شامہ''۔

قوتِ لامسہ کا بیان

'' لمس'' کے معنی ہیں ''چھونا'' پس چھو کے دریافت کرنے کی قوت کو لامسہ کہتے ہیں۔ یہ قوت انسان کے سارے بدن میں ہے۔ کوئی چیز انسان کو کسی جگہ سے چھوئے یا انسان کا کوئی عضو کسی چیز کو چھوئے رُوح کو معلوم ہو جاتا ہے کہ کسی نے مجھے چھوا اور یہ کہ وہ چیز سخت ہے یا نرم، سرد ہے یا گرم، نوکدار ہے یا مسطح۔ اگرچہ یہ قوت سارے بدن میں ہے لیکن ہاتھوں میں خصوصاً انگلیوں کے سروں میں زیادہ ہے۔ اسی لئے حکیم انگلیوں کے سروں سے نبض کو دیکھتا ہے اور سردی، گرمی، سستی و سرعت (پھُرتی) نبض کی معلوم کر لیتا ہے۔ اگر یہ قوت اللہ تعالیٰ ہمارے سارے بدن میں نہ رکھتا تو ہم مضر چیزوں کے صدمات سے کیونکر بچتے۔ رُوح کو خبر بھی نہ ہوتی اور بدن کہیں سردی یا آگ میں تلف ہو جاتا۔ پس اس قوت کے لئے خُدا کے شکر گزار ہو یا نہیں۔

''لمس'' کے وسیلہ سے جب رُوح کو کچھ خبر ملتی ہے تب وہ فوراً بدن کو حرکت دیتی اور اس شے کی طرف متوجہ ہو کے پہلے آنکھوں سے دیکھنا چاہتی ہے کہ وہ کیا ہے پھر جو مناسب سمجھتی ہے سو کرتی ہے۔

قوتِ باصرہ کا بیان

یہ دیکھنے والی قوت ہے اور صرف ان دو آنکھوں میں ہے اور بدن کے کسی ٹکڑے میں نہیں ہے۔ان میں خُدا کی تجویز سے ایک تروتازہ شیشہ سا ہے جس کے نیچے صاف پانی کا ایک چشمہ سا ہے۔رونے کے وقت آنسو اُسی چشمہ سے بہتے ہیں اور اس پانی سے وہ شیشہ یا پردہ تروتازہ رہتا ہے۔اس پردہ کی حفاظت اور روشنی کی کمی بیشی کے لئے پلکیں ہیں۔ہر پیش آئندہ شے کی تصویر بطور عکس کے اس پردہ یا شیشہ میں منقش ہوتی ہے۔اُس کے آگے دماغ میں ایک نقطہ ہے اور نقطہ انسانی رُوح اور اس شیشہ کے ساتھ ایک خاص نسبت میں واقع ہے۔پس رُوح انسانی بوسیلہ اُس نقطہ کے اُس عکس منقوش کو صاف دیکھ لیا کرتی ہے۔

تمام چیزیں جو تم دیکھتے ہو وہ چیزیں تو نہیں دیکھتے ہو مگر اُن کے عکوس (عکس) دیکھتے ہو۔رُوح شئے لطیف ہے اور عکوس بھی جو نظروں میں آتے ہیں لطیف ہیں۔خُدتعالیٰ سب کثیف اور بڑی بڑی چیزوں کو لطیف شکل میں لا کے اس لطیف رُوح کو دکھاتا ہے۔دیکھو اللہ تعالیٰ کی حکمت۔جب دور کی چیز دیکھنا ہے تو رُوح انسانی آنکھ کا مُنہ زیادہ کھولتی ہے اور زیادہ تر خارجی روشنی کی طالب ہے۔اگر نزدیک کی چیز دیکھنا ہے تو آنکھ کا منہ کچھ تنگ کھلتا ہے اور اسی حساب پر لوگوں نے دوربین اور خوردبین بنائی ہیں، جن کے شیشوں میں چیزوں کے عکس پڑتے اور بوسیلہ آنکھ کے اُن عکسوں کے عکس رُوح کو نظر آتے ہیں۔اگر آدمی اُس چیز سے جو بوسیلہ آنکھ کے معلوم ہوئی ہے واقف تھا تو اُسے پہچان لیتا ہے کہ وہ فلاں چیز ہے ورنہ اور زیادہ دریافت کے درپے ہوتا ہے کہ وہ کیا ہے؟

قوتِ سامعہ کا بیان

یہ سُننے کی طاقت ہے اور صرف دو کانوں میں ہے اور کہیں نہیں اور بغیر خارجی آواز کے سُن بھی نہیں سکتے۔کان سلامت ہوں اور آواز بھی کہیں سے آئے تب سُن سکتے ہیں۔آواز خواہ دبی ہو یا بلند، مگر کچھ آواز ہو اور آواز بھی بامعنی معلومہ ہو ورنہ صرف ایک کھڑکا سا کان میں پہنچے گا اور رُوح اُس کا مطلب نہ سمجھے گی۔جانوروں کی آوازیں، ہوا کے سناٹے، بادلوں کی گرج، بجلی کی کڑک، چیزوں کے ٹکرانے کے کھڑکے اور اجنبی زبانوں کے الفاظ سُننے سے رُوح کو کچھ مطلب معلوم نہیں ہوتا صرف آوازیں پہنچتی ہیں۔

عربی میں ''لفظ'' کے معنی ہیں'' پھینکنا''۔جب ایک آدمی دوسرے آدمی سے بات کرنا چاہتا ہے تو اپنے دل کا مطلب کلمات معلومہ میں لپیٹ کر بوسیلہ اپنی زبان کے ہوا میں مخاطب کی طرف پھینکتا ہے۔اور دیکھتے ہو کہ جیسے پانی کے تالاب میں پتھر مارنے سے ایک حلقہ سا بندھ جاتا ہے اسی طرح اس ہوا کے سمندر میں جو ہمارے چار طرف بھرا ہے جو کلمہ یا لفظ رُوح سے بوسیلہ زبان کے پھینکا جاتا ہے وہ ہوا میں ایک حلقہ یا دائرہ پیدا کرتا ہے اور حلقہ صدمہ کی طاقت کے موافق بندھتا ہے جس قدر لوگ کانوں والے اور اُن الفاظ کے سمجھنے والے اس حلقہ کے درمیان ہوتے ہیں وہ سب سُن اور سمجھ لیتے ہیں۔اور سُننے کا طور یہ ہے کہ یہ دو کان مثل دو پنکھوں کے ہیں جو ہوا کی جنبش کو جمع کر لیتے ہیں یا روک لیتے ہیں اور اُن کے آگے ایک سوراخ ہے جسکے سرے پر ایک جلی سی ہے اسی کو کان کا پردہ کہتے ہیں۔یہ پردہ ایسا کسا ہوا ہے جیسے ڈھولک کا چمڑا کسا ہوا ہوتا ہے۔پس ان پنکھوں کی جمع کی ہوئی یا رُکی ہوئی جنبش اُس ڈھولک میں جا کے بجتی ہے اور وہ پردہ اُس کے صدمہ سے ہلتا ہے۔اُس کے آگے ایک زنجیر سی ہے اور وہ زنجیر اُس جنبش کو مغز کے

اندر پہنچادیتی ہے وہاں سے نفس ناطقہ کو معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں شخص نے یوں کہا ہے۔ پس میں پوچھتا ہوں کہ خالق کی اس حکمت پر فکر کر کے اُسے سجدہ کرنا چاہتے ہو یا نہیں۔

قوتِ ذائقہ کا بیان

یہ چکھنے کی قوت ہے جو صرف زبان میں اللہ نے رکھی ہے۔ جب کوئی چیز زبان پر آتی ہے اور اُس کے اجزا تھوک میں کسی قدر گھلتے ہیں تو اس حِس کے وسیلہ سے اُس شے کا مزہ رُوح کو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کس مزہ کی ہے؟

زبان سے تین کام نکلتے ہیں مزے چکھتی ہے، بولتی ہے اور دانتوں سے چبائی ہوئی غذا کو ٹٹول کے معدہ میں اُترنے کی اجازت رُوح سے دلواتی ہے اور یہ زبان بڑی پھرتیلی ہے جلد جلد کام کرتی ہے۔

قوتِ شامہ کا بیان

یہ سونگنے کی قوت ہے اور صرف ناک میں ہے۔ جب کسی چیز کے لطیف اجزا بوسیلہ ہوا کے اُڑ کے ناک میں آتے ہیں یا آدمی کسی چیز کو ناک کے پاس لا کے بوسیلہ ہوا کے اوپر کی طرف دَم کھینچ کے اُس چیز کے اجزالطیفہ کو ناک میں چڑھاتا ہے تب اُس چیز کی خوشبو یا بدبو بوسیلہ اس حس کے رُوح کو معلوم ہو جاتی ہے۔ یہ حواس خمسہ ظاہری ہیں اور اُن کے کام بھی خاص خاص ہیں۔ حکیم کہتے ہیں کہ پانچ حواس باطنی اَور بھی ہیں اور وہ ان حواس ظاہری سے دریافت شدہ امور میں اپنا اپنا کام کیا کرتے ہیں۔ اُن کے نام یہ ہیں ''حِس مشترک''، ''خیال''، '' وہم''، ''قوت متصرفہ''، ''قوت حافظہ''۔

حِس مشترک کا بیان

حکما کہتے ہیں کہ انسان کے دماغ میں تین خانے یا تین بطن ہیں اور اُن کو '' بطن اول''، ''بطن دوم'' اور ''بطن سوم'' کہتے ہیں۔ ہر بطن میں دو مقام بتاتے ہیں اور اِن کو ''درجہ اول'' اور '' درجہ دوم'' کہتے ہیں۔ **''حِس مشترک''** ایک قوت ہے۔ دماغ کے بطن اول کے پہلے درجہ میں اُس کو حِس اس لئے کہتے ہیں کہ وہ ایک قوتِ حاسہ ہے اور مشترک اس لئے کہتے ہیں کہ وہ حواس خمسہ ظاہری اور نفس ناطقہ کے درمیان ہے۔ دونوں طرف اس کا علاقہ ہے جو کچھ حواس ظاہری دریافت کرتے ہیں اولاً اسی حِس کے سامنے آتا ہے اور یہی حِس رُوح کو خبر دیتی ہے۔

خیال کا بیان

'' خیال'' کے لفظی معنی ہیں پندآر وانچہ درخواب دیدہ شود دیادر بیداری تخیل کردہ اید وانچہ در آئینہ دیدہ شود۔ لیکن یہاں خیال سے مراد ''قوت متخیلہ'' ہے اور وہ ایک قوت ہے۔ بطن اول کے درجہ دوم میں جو کچھ حِس مشترک کو بوسیلہ حواس کے معلوم ہوتا ہے یہ قوت اس معلوم کے تصور کو اپنے اندر کچھ عرصہ تک محفوظ رکھتی ہے۔

وہم کا بیان

وہم کے معنی ہیں" انچہ در دل گذرد۔ یار فتن دل بسوئے چیزے بے قصد اَن" لیکن یہاں مراد وہم سے قوت واہمہ ہے اور یہ قوت بطن دوم کے آخر میں ہے اور اس کا یہ کام ہے کہ اپنے اندر تصورات کی تصویریں کھینچا کرتی ہے خواہ غلط ہوں یا صحیح۔

حواس خمسہ ظاہری سے دریافت ہو کے بوسیلہ حس مشترک کے جو کچھ خیال ہیں وہ حِس مشترک کے مخزن سے پہنچا کرتا ہے۔ یہ قوت واہمہ اُسے دیکھ کے شک وشبہ اور جو جو کچھ چاہتی ہے اپنی وہمی عمارتیں بنانا شروع کرتی ہے اور کبھی کسی دلی خواہش پر خواہ وہ خواہش نیک ہو یا بد بنیاد قائم کر کے اپنی وہمی عمارت کا ایک محل سا بنا کھڑا کرتی ہے۔ اس کا میدان بہت فراخ ہے۔ وہ لوگ جو اپنے دل ہی دل میں باتوں کا سلسلہ باندھا کرتے ہیں وہاں یہی قوت کام کیا کرتی ہے۔ کتاب الف لیلہ اور سب زٹلی مضمون جو دنیا میں ہیں اسی قوت کی تصنیف سے ہیں۔ ساری بے ایمانی کی جڑ یہی قوت ہے۔ یہ قوت نہ خُدا کے تابع ہوتی ہے نہ عقل کے۔ یہ رات دن بھونکتی رہتی ہے جب تک کہ انسان کی رُوح اس کو دھکا کے چُپ نہ کرائے یہ چُپ نہیں کرتی ہے سارے وسوسے اور شکوک اور خوف اور سب جھوٹے مذہب اور تمام بھوتوں اور جادوٹونوں کے واہیات خیال اسی سے نکلے ہیں۔ اسی نے بعض آدمیوں کو دہریا بعض کو ہمہ اُوست بولنے والا بنایا ہے اور قسم قسم کے واہیات اس نے آدمیوں کے خیالوں میں بھر رکھے ہیں۔ بعض صاحب علم آدمی کہتے ہیں کہ ایمانی عقائد کے بارے میں جیسے جاہلوں کے یقین واثق نظر آتے ہیں ہمارے ایسے یقین نہیں ہوتے ہیں۔ اس کا سبب میں یہی جانتا ہوں کہ ان لوگوں نے اس قوت واہمہ کی بہت اطاعت کی ہے اور اپنے آپ کو اسکے تابع کر دیا ہے۔ اس لئے شک میں شک اُن کے دلوں میں چلے آتے ہیں۔ اگر چاہو اُن سے کلام کر کے دیکھ لو کہ وہم پر وہم وہ اگلتے ہیں۔ افسوس ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اس قوت کی تابع کرے جو کہ نہ خُدا کے اور نہ عقل کے تابع ہو سکتی ہے اور پھر وہ آدمی یوں بھی کہے کہ میں سچا محقق ہوں۔

ہاں یہ قوت کچھ مفید بھی ہے اگر اس کو ایک حد میں کام کرنے دیں تا کہ ہم دھوکا نہ کھائیں۔ جو شکوک یہ پیش کرے اُن پر فکر کیا جائے نہ یہ کہ اُس سے مطلق العنان کر کے ہم خود اُس کے پیچھے ہو لیں۔ پھر وہ تو کبھی کسی بات پر بھی قائم نہ ہونے دے گی۔ ہمیشہ کہے گی شاید یوں نہ ہو یوں ہو، پھر بھی یوں ہو، یوں ہو۔

یہ قوت حیوانات میں زیادہ ہے۔ اس لئے کہ یہ خاص رُوح حیوانی کی قوتوں میں سے ہے۔ نفس ناطقہ کی یہ قوت نہیں ہے۔ نفس ناطقہ کی خدمت میں تو ہی پر خود حیوانی صفت ہے نہ ملکی۔ بعض اوقات اس کے کام سے فائدہ بھی ہوتا ہے۔ پس چاہئے کہ ہر آدمی یہ باتیں سُن کے ہوشیار ہو جائے کیونکہ اس قوت نے بہتوں کو گمراہی میں ڈال رکھا ہے۔ اگر اُس کو قابو میں نہ رکھا جائے تو وہ بعض صداقتوں کو بھی ماننے نہ دے گی۔ جب یہ قوت زیادتی دکھائے اُس کو دھمکانا چاہئے۔ صرف دھمکی سے اُس کا منہ بند ہوتا ہے اور ہم اس کا کان پکڑ کے اس کو خُدا کے اور عقل کے تابع کرتے ہیں اور جب یہ بیہودہ بکتی ہے تو ہم کہتے ہیں چُپ رہ مت بک۔ ہم اپنے آپ کو اس کے حوالہ ہر گز نہیں کرتے ہیں بلکہ اس کو اپنے تابع رکھتے ہیں۔

قوتِ متصرفہ کا بیان

یہ وہ قوت ہے جو خیالات میں اُلٹ پلٹ کر کے نتیجے نکالا کرتی ہے۔ یہ بطن دوم کے درجہ اول میں ہے۔ یہ نہایت خوب چیز ہے اور یہ حیوانی قوت نہیں ہے بلکہ نفس ناطقہ کی قوت ہے۔ اس کی بہت پرورش چاہئے۔ اس کا کام یہ ہے کہ بعض حاصل شدہ شکلوں کو بعض مطالب کے ساتھ مرکب کر کے اور اُن سے نتیجے نکال کے کہا کرتی ہے کہ ان شکلوں کا مقصد اور مطلب مجھے یوں معلوم ہوتا ہے سو میں نفس ناطقہ کے سامنے پیش کرتی ہوں، فتوی دینا اُس کا کام ہے۔ پس یہ قوت نفس ناطقہ کے لئے صلاح کار اور مشیر سا ہے۔ تجویزیں اس سے ہوتی ہیں اور حکم نفس ناطقہ سے ملتا ہے اور کبھی کبھی نفس ناطقہ اس کی تجویزوں میں بھی مرمت کرتا ہے۔ اس قوت کے دو نام ہیں کیونکہ دو طرح کے کام اس سے ہوتے ہیں جبکہ یہ قوت معلومات کی ترکیب میں نفس ناطقہ کے ساتھ مل کے کام کرتی ہے۔ تب اس کا نام " قوت متفکرہ" ہوتا ہے اور یہ اس کا کام اعلیٰ درجہ کا کام ہے لیکن جب یہ اپنا کام قوت واہمہ کے ساتھ مل کے کرتی ہے اُس وقت اُس کو "قوت متخیلہ" کہتے ہیں اور اس کام میں خطرے ہوتے ہیں۔

سب محققوں پر فرض ہے کہ تفکر و تخیل میں امتیاز کیا کریں تاکہ غلطی سے بچیں۔ تخیلات نے ایمان میں بڑا افساد مچا رکھا ہے۔ تفکرات بہت کم نظر آتے ہیں۔

قوتِ حافظہ کا بیان

یہ قوت بطنِ سوم کے درجہ اول میں رہتی ہے اور تصورات خیالیہ اور واقعات کی شکلوں کو یاد رکھتی ہے اور یہی دماغی دفتر کا آخری مخزن ہے اور یہ قوت واہمہ کی چیزوں کو بھی رکھ چھوڑتی ہے۔ پچاس برس گزرے یا کم زیادہ کہ زید نے عمر کو ایک خاص لباس میں جوان دیکھا تھا۔ اب عمر بوڑھا ہو کے اَور طرح کا ہو گیا لیکن زید کی قوت حافظہ میں اس کی وہی پہلی صورت محفوظ ہے۔ علیٰ ہذا القیاس اور اور مثالیں خود سوچ لو۔ یہ پانچ قوتیں جنہیں باطنی حواس کہا گیا انسان میں بچشم غور دکھائی تو دیتی ہیں تو بھی رُوح ایک شے ممتاز رہتی ہے۔ ان قوتوں ہی میں رَل مل نہیں جاتی۔ سب سے زیادہ بلند رتبہ کی قوت قوت متصرفہ ہے اور وہ بھی اپنے کام میں کبھی واہمہ کی طرف اور کبھی رُوح کی طرف جھکی ہوئی نظر آیا کرتی ہے۔ ایسی باتوں سے رُوح میں اور قوتوں میں امتیاز ہوتا ہے اور رُوح سب قوتوں پر حاکم رہتی ہے۔ غور سے اپنی اندرونی کیفیت پر سوچو۔

دفعہ ۱۹

انسان کے دل کا بیان

"دل" فارسی لفظ ہے۔ عربی میں اس کو" قلب" کہتے ہیں اور یہ عربی کا لفظ نہایت خوب اور پُر تعلیم ہے۔ "قلب" کے معنی ہیں" پلٹے کھانا اور اُلٹ پلٹ ہونا"۔ چونکہ انسان کا دل قسم قسم کے اثروں سے اُلٹ پُلٹ ہوتا رہتا ہے اس لئے اُس کا نام اچھا ہے اور خُدا کو بھی مقلب القلوب اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ دلوں کو اُلٹ پلٹ کر دیا کرتا ہے۔ دوسرے معنی قلب کے ہیں درمیانی جگہ یا صدر جگہ اور چونکہ یہ دل انسان میں گویا صدر جگہ ہے جہاں سے ارادے اور خواہشیں نکلتی ہیں اس لئے بھی اس کا نام قلب اچھا ہے۔ عام اصطلاح میں" دل" نام ہے اُس گوشت کے ٹکڑے کا جس کی شکل صنوبری یا گاجر جیسی ہے اور وہ انسان کے سینہ میں بائیں طرف ہے اور وہ ایک عضو رئیس ہے۔

صوفی کہتے ہیں کہ "دل ایک ربانی لطیفہ ہے اُس کا علاقہ اس جسمانی دل کے ساتھ ایسا ہے جیسا عرضوں اور صفتوں کا علاقہ اجسام اور موضوفات سے ہوتا ہے"۔

ایک اور محقق نے کہا ہے" حقائق روحانی اور خصائص نفسانی کے درمیان اور حقائق جسمانی و قوائی مزاجی کے درمیان ایک حقیقت ہے جامعہ اُس کو دل کہتے ہیں"۔

ایک اور عالم نے کہا کہ "دل ایک نورانی جوہر ہے۔ مجرد اور وہ رُوح حیوانی اور نفس ناطقہ کے درمیان ہے اور اسی سے انسانیت قائم ہوتی ہے۔ گویا یہ دل ملکیت اور حیوانیت کے درمیان کا مقام ہے جو دونوں ماہیتوں سے علاقہ رکھتا ہے"۔ یہ بات تو صاف ہے کہ انسان کے دل ہی سے ساری بدی اور نفسانی و حیوانی خواہشیں نکلتی ہیں اور دل ہی میں سے بہت سی خوبیاں بھی ظاہر ہوتی ہیں اور یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جب دل سے خوبیاں نکلتی ہیں تب اس دل کو نفسانی حیوانی بدخواہشوں سے بڑا جنگ کرنا پڑتا ہے اور جب دل سے بدی آتی ہے تب اُس سے ملکیت کی مخالفت ہوتی ہے۔ اسی سے ظاہر ہے کہ دل درمیان میں ہے ملکیت اور حیوانیت کے اور اس کا علاقہ دونوں طرف ہے۔

کلام اللہ میں انسان کے دل کا بیان بہت ہوا ہے۔ بائبل کے درمیان تخمیناً دو سو آیتیں ہونگی جن میں دل کا بیان ہوا ہے۔ اور کوئی کتاب دنیا میں ایسی نہیں ہے جو دل کا ایسا بیان دکھائے جیسا بائبل شریف نے دکھایا ہے۔ اس کا سبب یہی ہے کہ بائبل خُدا سے ہے اور خُدا تعالیٰ سب آدمیوں کے دلوں کی کیفیت سے پوری واقف ہے۔ اس کی نگاہ میں سب اولین و آخرین کے دلوں کی کیفیت پوری پوری موجود ہے۔ اسی لئے وہ آدمی کے دل کا بیان اپنی کتاب میں پورا پورا کر سکا ہے۔

خُدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ ہر ایک انسان کی رُوح اپنے دل کی حفاظت خوب طرح سے کرے کیونکہ جنگ کا مقام وہی ہے اسی جگہ سے فتح یا شکست ہوتی ہے۔ شیطان چاہتا ہے کہ آدمی اپنا دل اُس کو دے تاکہ وہاں بیٹھ کے وہ اُس پر حکومت کرے اور قابض ہو کے اپنے ساتھ اُسے جہنم میں لے جائے۔ خُدا فرماتا ہے کہ تم سب اپنا دل مجھے دو تاکہ میں تمہارے دلوں میں سکونت کروں اور تم میرے ساتھ ہمیشہ خوشی میں رہو۔

اور انسان کی رُوح کا یہ اختیار ہے کہ اپنا دل جس کو چاہے دے اور یہ اختیار اس لئے ہے کہ انسان آزاد پیدا کیا گیا ہے تاکہ اس پر عدالت واجبی ہو سکے۔ قیامت اور عدالت کے دن سے پہلے دوزخی اور بہشتی لوگ اسی سے پہچانے جا سکتے ہیں کہ اُن کے دلوں میں حاکم کون ہے؟ اور کہ وہ کس کی حکومت کے تحت میں موئے ہیں؟ وہ جسکی حکومت میں موئے ہیں اُسی کے ساتھ، اُسی کے سپاہی اور اسی کی چیزوں کے وارث ہوتے ہیں۔ اب ناظرین اپنے دلوں کی طرف غور کر کے آپ کو پہچانیں کہ وہ کس کے لوگ ہیں؟

بہ نسبت محمدی اہل شرع کے صوفیوں نے دل کا فکر زیادہ کیا ہے اور اُس کے درست کرنے کی کچھ تدبیریں بھی سوچی ہیں۔ میں نے جب تک بائبل شریف سے روشنی نہ حاصل کی تھی میں بھی صوفیوں کی تدبیروں پر فریفتہ تھا۔ اب مجھے معلوم ہو گیا کہ صوفیوں کی باتیں اگرچہ محمدیوں کی باتوں سے بہتر ہیں مگر فی الحقیقت نکمی ہیں۔ وہ لوگ بعض ریاضتوں اور بعض تصورات اور بعض وظائف کے وسیلہ سے دلوں کو سدھارنے کے درپے رہتے ہیں لیکن یہ چیزیں اس مرض کی دوا نہیں ہیں۔

دل پاک ہوتا ہے صرف مسیحی ایمان سے کیونکہ وہ ایمان خُدا کی بخشش ہے اور مسیح کی صلیبی موت کی تاثیر سے جو بوسیلہ ایمان کے مومن میں اثر کرتی ہے۔ دل کی بدخواہشیں مردہ سی ہو جاتی ہیں اور مسیح خُداوند کی قیامت کی تاثیر سے دل میں ایسی تازگی اور قوت اور روشنی آتی ہے کہ مسیحی مومن بدی پر اور دنیا، نفس اور شیطان پر غالب آتا ہے اور فتح پاتا ہے اور خُدا کا مقرب ہو جاتا اور دُنیوی دکھ سکھ میں خُدا کی مرضی کا مطیع ہو کے اپنی زندگی بسر کرتا ہے اور یہی بڑی نعمت ہے جس کے سب محتاج ہیں۔

دفعہ ۲۰

دماغ، جگر، گُردوں اور انتڑیوں کا بیان

دماغ یہ لفظ تین معنوں میں آتا ہے کبھی سر کے اندر کے پردوں کی چربی اور گودے کو دماغ کہتے ہیں اور وہاں کچھ حس نہیں ہے۔ کبھی تمام کھوپڑی کو دماغ کہتے ہیں اور چونکہ وہاں پٹھے بھی ہیں اس لئے وہاں حِس بھی ہے۔ کبھی سارے سر کو دماغ کہتے ہیں۔ لیکن جب کہا جاتا ہے کہ فُلاں بڑے دماغ کا آدمی ہے تب اُس کی عقل کی گہرائی اور بڑی رسائی پر اشارہ ہوتا ہے اور کبھی اُس کے غرور پر اور کبھی اس کی حماقت پر بھی اسی لفظ سے اشارہ کرتے ہیں۔

حکیم کہتے ہیں کہ ”دماغ وہ عضو رئیس ہے جو کھوپڑی میں ہے اور اُس کی شکل مثلث مخروطی ہے۔ وہی رُوح کا محل ہے جہاں وہ رہتی ہے۔ کان اور آنکھیں زبان اور ناک جو پیشی کے خادم ہیں اُس کے بہت ہی نزدیک ہیں صرف ایک قوت لامسہ بطور جاسوسی کے سارے بدن میں چھوڑی ہوئی ہے۔ دیکھو اللہ کی شان“۔

جگر یعنی ''کبد'' دہنے پہلو میں ایک عضو ہے اور وہ بھی عضو رئیس ہے۔ دل، دماغ اور جگر یہی تین عضو رئیس کہلاتے ہیں۔ ان کی بہت حفاظت چاہئے کیونکہ جب ان میں سے کسی میں خلل آیا تو پھر آدمی کی زندگی نہیں ہے۔ جسمانی دلاوری جگر کی قوت پر منحصر سمجھتے ہیں۔ جب کہتے ہیں کہ وہ بڑے جگرے کا آدمی ہے تب اس کی دلاوری پر اشارہ ہوتا ہے۔

گُردے وہی دو گولے سے ہیں جو جانوروں میں دیکھتے ہو۔ عربی میں واحد کو '' کلیہ '' یا ''کلوہ'' کہتے ہیں اور دونوں کو کلیتیں کہا کرتے ہیں۔ (زبور ۷:۹) میں ہے کہ خدائے صادق دلوں اور گردوں کو جانچتا ہے۔

انتڑیاں جنہیں عربی میں '' معا'' کہتے ہیں جس کی جمع '' امعا'' ہے۔ انسان کے پیٹ میں چھ انتڑیاں بتاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ گہرا غم اور بڑی خوشی انتڑیوں تک محسوس ہوتی ہے۔ (نوحہ ۱:۲۰) میں بیان ہے کہ میری انتڑیاں اُبلتی ہیں۔ اُس زمانہ کے لوگ ایسا سمجھتے تھے کہ دل کی پوشیدہ باتیں گردوں میں چھپی رہتی ہیں اور گہرا غم اور گہری خوشی دل سے آگے بڑھا کے انتڑیوں تک موثر ہے۔ پس یہ اگلے زمانہ کا محاورہ تھا اور اسی محاورہ پر کلام اللہ میں کہا گیا ہے کہ خُدا دل اور گردوں کا جاننے والا ہے اور کہ غم سے میری انتڑیاں کلپتی ہیں۔ اور کبھی کبھی محاورہ میں کہا جاتا ہے کہ انتڑیاں اسیس دیتی ہیں۔

دفعہ ۲۱

غم کے بیان میں

غم ایک کیفیت ہے ناپسندیدہ جو انسان کے دل پر طاری ہوتی ہے۔ جس سے دل سُست اور چہرہ افسردہ ہو جاتا ہے اور زیادہ غم سے جسمانی قوت میں ضعف آجاتا ہے (امثال ۱۲:۲۵)۔ انسان کے دل کا غم اُسے جھکا دیتا ہے اور شکستہ خاطر کرتا ہے (امثال ۱۵:۱۳)۔

دل کے کمزور آدمی غم کی برداشت نہ کر کے کڑکڑاتے اور واویلا کرتے اور کبھی کبھی حدِ اعتدال سے باہر ہو جاتے ہیں لیکن بردبار اشخاص جو صابر اور جفاکش ہیں برداشت کر کے اعتدال میں رہتے ہیں۔ غم کھانے کا ایک وقت ہے (واعظ ۳:۴)۔ سب جانتے ہیں کہ انسان کو غم کبھی کبھی ہوتا ہے ہمیشہ نہیں رہتا۔ اگر کوئی آدمی اپنی زندگی کے گذشتہ وقت پر فکر کرے اور سوچے کہ کس قدر وقت غم اور دُکھ میں کٹا اور کتنا وقت آرام میں گزرا تو اُسے معلوم ہو جائیگا کہ خوشی و آرام کے لئے بہت وقت تھا اور غم کے لئے بہت ہی تھوڑا وقت تھا۔ لیکن نادانی سے یا مبالغہ سے بعض آدمی کہا کرتے ہیں کہ میری تو ساری عمر غم میں گزری ہے یہ ناشکری کی بات ہے اور درست نہیں ہے۔

غم جو کبھی کبھی دلوں میں آجاتا ہے اچھا نمونہ ہے۔ اُس آئندہ دکھ کی حالت کا جو گناہوں کے وبال کے سبب سے بے ایمانوں اور بدکاروں کا حصہ ہوگا جسے آدمیوں نے ابھی نہیں دیکھا چاہئے کہ ہم سب ان دنیاوی غموں کی تلخی کو چکھ کے ہوشیار ہو جائیں اور وہ کام نہ کریں جن کے سبب سے آئندہ ابدی غموں کے سزاوار ہوتے ہیں۔

لوگ ہنسی خوشی کو بہت پسند کرتے ہیں اور اپنی زندگی کا وقت خوشی میں بسر کرنا چاہتے ہیں بلکہ بعضوں کے تو ہر وقت دانت پسرے ہی رہتے ہیں۔ قہقہے مار مار کر ہنستے اور ایسی ایسی باتیں دل سے نکالتے ہیں جن سے آپ ہی ہنسیں اور دوسروں کو بھی ہنسائیں۔ لیکن کلام اللہ میں لکھا ہے۔ ''غمگینی ہنسی سے بہتر ہے''(واعظ ۷: ۳)۔ بہت ہنسی سے آدمی کا دل مردہ سا ہو جاتا ہے اور غم دل کو سدھارتا ہے خُداوند مسیح نے فرمایا ہے کہ غمگیں لوگ مبارک ہیں(متی ۵: ۴)۔ پس غم نشان برکت ہے۔ غم دو قسم کا ہوتا ہے۔

اول دنیا کا غم ہے کہ دنیاوی چیزوں کے لئے اہل دنیا کے دلوں میں موثر ہوتا ہے اور یہ بہت ہے۔ چاروں طرف اہل دنیا اسی غم میں مبتلا ہیں۔ کبھی کبھی یہ دنیاوی غم بھی آدمیوں کو خُدا کی طرف کھینچ لاتا ہے لیکن اکثر یہ غم ہلاکت کا باعث ہوتا ہے۔

دوسرا الٰہی غم ہے جو اپنے اور دوسروں کے گناہوں کی یادگاری سے دلوں میں آتا ہے اور توبہ کی برکت دل میں پیدا کرتا ہے یہی غم مبارک ہے(۲۔ کرنتھیوں ۷: ۱۰)۔ غم کی پھر اور طرح پر دو قسمیں ہیں ''بیوقوفی کا غم'' اور ''دانشمندی کا غم''۔

بیوقوفی کا وہ غم ہے جو قاضی صاحب کو تھا کسی نے پوچھا قاضی جی آپ دُبلے کیوں ہو گئے ہیں؟ فرمایا کہ شہر کے غم نے مجھے دُبلا کر دیا ہے۔ جو باتیں الٰہی انتظام کے واقعات سے دنیا میں ہوتی ہیں اور یوں ہی ہوا کریں گی جب تک کہ آخرت آئے۔ پس اُن کے لئے بے حد واویلا سے کیا فائدہ ہے مثلاً زوال دولت کا غم یا موت احباب کا غم یا بعض رشتہ داروں اور دوستوں کی طرف سے بے مروتی اور بے انصافی اور جفا و دغا دیکھنے کا غم وغیرہ۔ بہت باتیں ایسی ہیں جن سے دل پر چوٹ لگتی ہے لیکن ایسی چوٹوں کے نیچے دانت پسار کے گر جانا بیوقوفی ہے کچھ عقل کو بھی کام میں لانا چاہئے۔

دانشمندی کا وہ غم ہے جس کا ذکر (واعظ ۷: ۴) میں ہے کہ ''دانا کا دل ماتم کے گھر میں ہے اور احمق کا دل عشرت خانہ سے لگا ہے''۔ دانشمند آدمی ہر وقت ہر امر میں انجام بخیر کے لئے دور اندیش اور فکر مند رہتا ہے اور یہ دور اندیشی و فکر مندی اس کے دل کے لئے گویا ایک ماتم خانہ سا ہوتا ہے اور یہ ماتم خانہ اچھا ہے۔ بیوقوف آدمی نادان بچوں کی مانند کچھ دور اندیش نہیں ہے۔ ادنی فانی چیزوں کو پا کے خوش ہوتا اور اُن کے زوال سے بچوں کی طرح چِلا چِلا کر روتا ہے۔ پس اِس (بیوقوف آدمی) کی خوشی اور اس کا غم بیوقوفی کے ساتھ ہے اور اُس (دانش مند آدمی) کی خوشی اور غم دانشمندی کے ساتھ ہے اور کامیاب بھی وہی ہو گا۔

بعض غم اور دکھ انسان کی صحت روحانی کے لئے بھی اللہ تعالیٰ سے جو حقیقی مدبر اور پیارا باپ ہے آیا کرتے ہیں۔ وہ انسان کے حق میں بمنزلہ دوا کے ہوتے ہیں اُن کی تحقیر نہ چاہئے۔ ہر ایک غم اور دکھ جو انسان پر آتا ہے اگر وہ اُس سے کچھ نصیحت حاصل نہ کرے تو وہ غم فی الحقیقت غم ہے اور جو وہ اُس سے کچھ اصلاح پذیر ہو تو وہ نہ صرف غم ہے بلکہ برکت ہے۔

غم اگرچہ تلخ چیز ہے مگر اُس میں کچھ مزہ بھی ہے۔ ایک شاعر کہتا ہے ''غم کھاتا ہوں لیکن میری نیت نہیں بھرتی''۔ کیا غم ہے مزہ کا کہ طبیعت نہیں بھرتی۔ اگرچہ اس شاعر نے دنیاوی غم کی نسبت ایسا کہا ہے لیکن فی الحقیقت الٰہی غم میں مزہ ہے۔ دنیا کے غم میں محض تلخی ہے۔ مسیح خُداوند کی صلیبی موت کے وقت مسیحیوں کو بھی بڑا غم اور الم ہوا تھا لیکن بموجب ارشاد مسیح کے اُن کا وہ غم مبدل بخوشی ہو گیا تھا(یوحنا ۱۶: ۲۰) اور وہ خوشی اب تک ہماری روحوں میں برابر چلی آتی ہے اور ابد تک بجلال رہے گی۔ غم اور الم کا وجود تو معدوم نہ ہو گا بلکہ بے ایمانوں کے لئے غم کا سمندر ظاہر ہو گا اور وہ ابد تک مغموم رہیں گے۔ ہاں مسیحی مومنین کے لئے غم ایسا معدوم ہو گا کہ وہ پھر اُس کا منہ نہ دیکھیں گے۔ ''اور جن کو خُداوند نے مخلصی لوٹیں گے اور صیون میں گاتے ہوئے آئینگے اور ابدی سرور اُن کے سروں پر ہو گا۔ وہ خوشی اور شادمانی حاصل کرینگے اور غم واندوہ کافور جائیں گے''(یسعیاہ ۳۵: ۱۰)۔ ''اور وہ

(خُدا) اُن کی آنکھوں کے سب آنسو پونچھ دے گا۔اس کے بعد نہ موت رہے گی اور نہ ماتم رہے گا۔ نہ آہ و نالہ نہ درد۔پہلی چیزیں جاتی رہیں "(مکاشفہ ۲۱: ۴)۔اس وقت بھی مسیحیوں کے غموں میں غیر مسیحیوں کے غموں کی نسبت بہت فرق ہوتا ہے۔ان کے غم ہلکے اور اُن کے غم بھاری ہیں۔ دیکھو کیا لکھا ہے تم اوروں کی مانند جو ناامید ہیں غم نہ کرو(۱۔ تھسلنیکوں ۴: ۱۳)۔ وہ قوی امید جو عیسائیوں کو مسیح میں ہے ان کے غموں کا بوجھ ہلکا کرتی ہے۔ ناامید شخص کے لئے کیا آسرا ہے کچھ نہیں پورا بوجھ غم کا اُسے اُٹھانا ہوتا ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ غم کے وقت ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ اگر کوئی تم میں غمگیں ہو وہ دعا مانگے (یعقوب ۵: ۱۳) یعنی خُدا کے حضور میں جائے اور اپنا بوجھ اُس کے سامنے رکھے وہاں سے قوت صبر ی اور تسلی حاصل کرے گا۔

دفعہ ۲۲

خوشی کے بیان میں

خوشی ایک شیریں کیفیت ہے جو دل پر آتی ہے۔ سب آدمی رات دن خوشی کی تلاش میں ہیں۔ وحشی بھی اور بچے بھی، احمق بھی اور دانش مندی بھی، ایماندار اور بے ایمان بھی سب خوشی چاہتے ہیں۔ لیکن **خوشی دو قسم کی ہے فانی اور غیر فانی۔** "فانی خوشی" فانی چیزوں میں ہے ۔یہ فریبی خوشی ہے جو چند روزہ ہے اور آخر کار یہ خوشی مبدل نعم ہو جائے گی اور مسلوب (نابود) ہو گی۔ یہ خوشی جسمانی خواہشوں کی تکمیل میں ہے کسی قدر تو اس کی حاجت دنیا میں انسان کو ہے مگر یہ نادانی کی بات ہے کہ ہم اس کے ہو رہیں۔ دانشمند کی رُوح اس خوشی سے کبھی سیر نہیں ہوتی اور نہ ہو سکتی ہے۔

"غیر فانی خوشی" غیر فانی چیزوں میں ہے۔ یہ خُدا کے پاس ہے اور خُدا کی قربت سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ رُوح کا پھل ہے جو مسیح بخشتا ہے اور اس کا بیان انجیل شریف میں ہے۔ وہ مومنین کی رُوحوں میں موثر ہوتی ہے اور مسیح اپنے خاص بندوں کو اس خوشی سے بھر دیتا ہے۔ فانی خوشی اس غیر فانی خوشی کے سامنے ایسی حقیر ہوتی ہے کہ خُدا کے بندے اسکے لینے کو اُسے چھوڑ دیتے ہیں اور ان کا ایسا کام بیجا نہیں بلکہ بجا ہے۔ ہاں مناسب طور سے کبھی فانی خوشی کو بھی وہ عمل میں لاتے ہیں مگر اُسے مغلوب بغیر فانی رکھتے ہیں۔

لیکن وہ دنیادار جو غیر فانی خوشی کی طرف سے اندھے ہیں۔ فانی خوشی کی تلاش اور تکمیل میں تمام زندگی بسر کر کے مر جاتے ہیں اور اُن کی خوشی اسی جہان میں فنا ہو جاتی ہے اور اُن کی روحیں بے خوشی کے اندر تک ہائے ہائے کرتی ہوئی دُکھ میں چلی جاتی ہیں۔ ناظرین کتاب ہذا کو چاہئے کہ غیر فانی خوشی کو تلاش کریں فانی خوشی پر فریفتہ ہو کے چُپ نہ کر رہیں۔

دفعہ ۲۳

جسم کے بدکاموں کے بیان میں

یہاں جسم سے مراد رُوح حیوانی ہے کیونکہ وہ جسم کی حد میں داخل ہے۔رُوح حیوانی کے کاموں کو خُدا کے کلام میں جسم کے کام کہا گیا ہے اور یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ رُوح حیوانی جب بُرے کام کرتی ہے اور نفس ناطقہ اُسے دبا کے نہیں رکھتا بلکہ اُس کی خواہشوں کا خود مطیع ہو رہتا ہے تو خُدا کا غصہ اُس شخص کی طرف ہوتا ہے۔

رُوح حیوانی ایک فانی چیز ہے۔وہ بدن کے ساتھ فنا ہو جائے گی۔اُس پر کچھ ملامت نہیں اور نہ اسے ماخذ میں آنا ہے۔لیکن رُوح انسانی جو باقی اور غیر فانی ہے اور جس میں ادراک اور تمیز ہے وہ کیوں ایک جانور کی مطیع ہو جاتی ہے اس لئے وہ آفتوں کی سزاوار ہے۔

اس بات کو یوں سمجھنا چاہئے کہ اگر کوئی گھوڑے کا سوار جو انسان ہے گھوڑے کی لگام اپنے ہاتھ میں نہ رکھے اور اپنی مرضی کے موافق جہاں چاہے اُسے نہ لے جائے بلکہ لگام ڈھیلی چھوڑ کے آپ گھوڑے کا مطیع ہو جائے کہ جدھر چاہے خود گھوڑا اُسے لے جائے تو کیا وہ بچے گا؟ یا خود کش ہو کے مرے گا؟ اور قصور کس کا ہو گا؟ گھوڑے کا یا اُس شخص کا جس نے اس کے ہاتھ گھوڑا بیچا تھا یا خود یہ حضرت ملامت کے لائق ہوں گے جنہوں نے اُس جانور کو قابو میں نہ رکھا؟ یہی حال جسمانی بدخواہشوں کی اطاعت سے آدمیوں کی روحوں کا ہو رہا ہے۔جسم کی اصولی بدخواہشوں کی فہرست یہ ہے۔

۱۔ شہوت اُس خواہش کا نام ہے جو نر اور مادہ میں میل کی خواہش کہلاتی ہے۔اصل تو اُس کی خوب ہے کہ تناسل کی غرض سے اللہ نے یہ قوت جانوروں میں رکھی ہے اور انسان میں بھی ہے۔جب یہ قوت انسان میں ظاہر ہوتی ہے اُس وقت کو بلوغت کا وقت کہتے ہیں اور جب آدمی بڈھا ہو جاتا ہے اور قوتیں کمزور ہو جاتی ہیں اُس وقت یہ قوت بھی منقطع ہو جاتی ہے۔

نادان، احمق، ناتجربہ کار جوان جو نہ خُدا سے ڈرتے اور نہ اہل تجربہ بزرگوں کی نصیحتیں سُنتے ہیں وہ اس قوت میں آ کے بہت اُچھلتے ہیں۔اس کو دباتے نہیں بلکہ اس میں مگن ہو جاتے ہیں اور اپنی دیگر قوتوں کو اس کا مغلوب کرتے ہیں اور ایسا مغلوب کرتے ہیں گویا اُن کے حواس خمسہ پر بھی شہوت چھا جاتی ہے۔بُرے گیت گاتے، بُری باتیں خوشی سے سُنتے سناتے، بدصحبتوں کو پسند کرتے اور نفس امارہ کو مزہ دیتے پھرتے ہیں۔شریر عورتوں کے درپے ہوتے ہیں حرامکاری پر کمر باندھتے ہیں اور سخت بے حیا ہو جاتے ہیں۔چاروں طرف تاک جھانک کرتے پھرتے ہیں۔گھوڑوں کی طرح ہنہناتے اور کتوں کی طرح کتیوں کے درپے پھرتے ہیں۔آپس میں لڑتے بھی ہیں، بندشیں بھی باندھتے ہیں، نعرے مارتے، فریب دیتے اور فریب کھاتے پھرتے ہیں۔

بڑی بڑی آفتیں بھی ان پر آ جاتی ہیں اور ان کی خوب خانہ خرابیاں ہوتی ہیں۔آتشک کی بیماری اور برص یا کوڑھ اسی سے ہوتا ہے اور ایسی سخت تکلیف ہوتی ہے کہ ان بیماریوں میں مبتلا ہو کے انسان موت مانگتا ہے اور نہیں آتی۔اگر کسی عیاش کو ایسی بیماریوں نہ ہوں اور وہ کچھ عرصہ تک اُچھل کود کے بیٹھ رہے تو بھی وہ باقی عمر بھر رویا کرتا ہے۔اس لئے کہ اُس میں سے اصلی قوت نکل جاتی ہے اور اُس کی اولاد کمزور پیدا ہوتی ہے اور اُس کے بچے آئے

دن بیمار رہتے بلکہ کم عمر میں مر جاتے ہیں۔ یہ آفت باپ کی شرارت سے اولاد میں آتی ہے اور اُس سزا کے سوا جو ایسے لوگوں پر خُدا سے آنے والی ہے یہ حرامکار لوگ ایسی دنیا میں اپنا بہت نقصان کر لیتے ہیں۔ اکثر اُن کی نسلیں منقطع ہو جاتی ہیں اور اُن کے اباکا نسبی سلسلہ نیست و نابود ہو جاتا ہے۔

ان لوگوں میں بعض تو غریب بدکار ہیں جو بے تہذیب اور جاہل ہوتے ہیں۔ وہ زیادہ رسوا اور خوار ہو جاتے ہیں۔ بعض مہذب، ذی علم اور دولتمند بدکار ہیں اور وہ کچھ سنجیدگی اور دانائی اور ثروت خفیتاً ایسے کام کیا کرتے ہیں اور وہ اُن غریبوں کی نسبت کچھ کم رسوا ہوتے ہیں تو بھی الٰہی غضب، آتشک و کوڑھ، کمزوری نسل اور انقطاع نسب وغیرہ آفات میں سب کا برابر حصہ ہے۔ بعض دینداری کے لباس میں چھپ کے ایسے بدفعلوں کے مرتکب ہوتے ہیں وہ سب سے زیادہ بُرے ہیں۔ ایسوں کے حق میں کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

لمبی ڈاہڑیوں پہ نہ جادِلا   یہ سب آہوؤں کے ہیں مبتلا

یہ شکار کرتے ہیں برملا   انہیں ٹٹیوں کی آڑ میں   (ٹٹی۔آڑ، پردہ، لمبی ڈاڑھی)

خُدا کا بندوبست جو انسان کے لئے سراسر مفید ہے اس بارے میں یوں ہے کہ جوان آدمی ایک شادی کرے اور اپنی اُس بی بی کو جو مناسب طور سے اُس نے پائی ہے محبت اور عزت سے رکھے اور اُسی کے ساتھ زندگی بسر کرے۔ ہاں اگر دونوں میں سے ایک مر جائے اور دوسرا پھر شادی کے لائق رہے۔ اگر وہ چاہے تو پھر اپنا بندوبست پاک طور پر کر لے تاکہ گناہ سے بچے اور اس قوت کو قابو میں رکھے۔ خُدا سے ڈرے اور اپنے بدن کی بھی حفاظت کرے اور دانائی سے رہے۔ ایسا آدمی خُدا سے برکت پائے گا۔ دنیا میں بھی خوش رہیگا اور آخر کو اُس کا بھلا ہو گا اور اس کی اولاد بھی بہت بیماریوں سے بچی رہے گی۔ تمام سچے عیسائی ایسا ہی کرتے ہیں۔

۲۔ طمع جس کو لالچ کہتے ہیں اصل اس کی بھی خوب ہے اور وہ یہ ہے کہ آدمی اپنی حاجتوں کے رفع کرنے میں مناسب کوشش کرے اور اپنے آرام کی چیزیں تلاش کر کے جائز طور پر لے۔ اگر اُسے ہوکا (کسی چیز کی بے انتہا خواہش) لگ جائے تب وہ طامع اور لالچی ہے۔ اُس کی نگاہ انصاف اور حق پر نہیں رہتی جس قدر پاتا ہے اُس سے سیر نہیں ہوتا بلکہ خُدا کو چھوڑ کے زرپرست ہو جاتا ہے۔ ایسے آدمی کا دل ہمیشہ دکھ میں رہتا ہے۔ اگر وہ ایسا ہی مر گیا تو خُدا کے غضب کی آگ میں چلا جائیگا۔ طمع خواہش حیوانی ہے۔ نفس ناطقہ کی یہ خواہش نہیں ہے بلکہ اس کے خلاف قناعت نفس ناطقہ کی خواہش ہے جو نہایت اچھی چیز ہے۔

۳۔ حسد کیا ہے؟ دوسرے شخص کے پاس کوئی اچھی چیز دیکھ کے اپنے دل میں جلنا ہے۔ یہ بھی حیوانی خواہش ہے۔ تنگ دل لوگوں میں حسد بہت ہوتا ہے کشادہ دل لوگ حاسد کم ہوتے ہیں۔ خیر خواہی اور خیر اندیشی اور برادرانہ محبت جو نفس ناطقہ کی صفتیں ہیں حسد اُن کے خلاف ہے۔

۴۔ غرور یہ خیال رکھنا کہ میں بھی کچھ ہوں آپ پر فریفتہ ہونا ہے اور یہ حیوانی صفت ہے۔ ہر ایک سانڈ یہ سمجھتا ہے کہ " ہم چو من دیگرے نیست "(فارسی مثل۔ میری مثل دوسرا نہیں) یہی حال اہل تکبر کا ہے کہ اپنے آپ کو بڑا آدمی جانتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو جو خاکسار ہیں حقیر سمجھتے ہیں۔ یہ غرور پیدا ہوتا ہے۔ قومی شرافت کے خیال سے اور دولتمندی کی وجہ سے اور علمی لیاقت سے بھی بلکہ بعض دینداروں میں بھی اُن کی دینداری اُن کی جان کا وبال ہو جاتی ہے جبکہ اُن میں بجائے فروتنی کے غرور پیدا ہوتا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ میں کچھ ہوں۔ سچی دینداری کا پھل یہ ہے کہ

میں کچھ نہیں ہوں لیکن جھوٹی دینداری کہتی ہے کہ ہاں میں کچھ ہوں۔ بعض خُدا کے بندے قوم سے بھی شریف ہیں، دولتمند اور صاحب علم بھی ہیں تو بھی خاکسار فروتن رہتے ہیں اور غرور کو دل میں ہر گز جگہ نہیں دیتے ہیں۔

۵۔ کینہ کسی کے ساتھ دل میں پوشیدہ دشمن رکھنے کا نام ''کینہ'' ہے۔ یہ ایک آگ ہے جو آدمی کے دل میں پوشیدہ یا دبی ہوئی رہتی ہے اور اُسی کے دل کو اندر اندر جلاتی رہتی ہے۔ پھر موقع پاکے بھڑکتی ہے تاکہ اُس کو بھی جلادے جس کی نسبت یہ کینہ ہے۔ یہ بھی حیوانی صفت ہے۔ نفس ناطقہ کی خواہش یہ ہے کہ انسان کا دل سب کی طرف سے صاف ہو۔ یاد رکھنا چاہے کہ کینہ ور آدمی مسیحی نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے دل سے کینہ نکل نہ جائے اور وہ لوگ جو مسیحی کہلاتے اور دلوں میں کینہ رکھتے ہیں وہ ابھی تک موت میں رہتے ہیں۔ مسیح کی رُوح اُن میں نہیں ہے اور وہ خدا کے سامنے مسیحی نہیں ہیں۔

۶۔ غضب یعنی '' غصہ'' یہ صفت عام ہے۔ یہ حیوانوں میں بھی ہے اور نفس ناطقہ انسانی میں بھی ہے بلکہ خُدا میں بھی ہے کہ وہ شریروں پر غصہ ہوتا ہے اور اُن کی شرارت کے سبب سے ناراض ہو کے اُن پر آفتیں نازل کیا کرتا ہے اور سب شریروں کو ابد تک اپنے غصہ کے سایہ میں رکھے گا یہی مقام دکھ کا ہے۔ مگر نادانی کا غصہ اور بے جا غصہ اور حیوانیت کے جوش کا غصہ اور زود رنجی کا غصہ اور بے حلم غصہ مکروہ بلکہ حرام اور خون ریزی کے برابر ہے۔ اُسی سے آدمی گنہگار ہوتا ہے۔ ہاں دانشمندی اور خیر اندیشی کے ساتھ انتظام کے لئے جو غصہ ہے وہ جائز اور مفید بھی ہے چاہئے کہ ہم سب اپنے غصوں کو بھی پرکھیں۔

۷۔ دشنام دہی یعنی ''گالیاں بکنا'' یا کچھ اور بُری باتیں کسی کی نسبت منہ سے نکالنا اَور کو سنانا یا بد دعائیں دینا یا اپنے اُوپر آپ یا کسی غیر پر لعنت بھیجنا یہ سب کام بُرے ہیں اور آدمیوں کے دلوں پر اپنے منہ سے چوٹ مارنا ہے۔ ایسی باتوں سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اُس شخص کا دل اندر سے ناپاک ہے اور وہ بُری باتیں جو اس کے منہ سے نکلتی ہیں اُس کے ناپاک دل کی بدبو ہیں اور دِلی بدبو اُس کے منہ سے باہر آتی ہے اور سُننے والوں کے مزاج خراب کرتی ہے اور اُس آدمی کی بے دینی ظاہر ہوتی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اُس شخص کے دل میں شیطان رہتا ہے۔ وہی اُس کے اندر بیٹھا ہوا ہے جو ایسی بُری باتیں بولتا ہے۔ خدا نے اُس کے دل کو نہیں چھوا۔ اُس کی عبادات، نماز (دعا) اور روزہ سب واہیات ہیں۔ کچھ اثر نیکی کا اُس کے دل پر نہیں ہوا ہے۔ سچے مسیحی جن کے دل پاک ہیں ایسے کام ہر گز نہیں کرتے۔ اُن کے اندر سے صرف خوبی نکلتی ہے اور ظاہر کرتی ہے کہ اُن کا دل خُدا کے ساتھ ہے۔ طالبانِ حق کو معلوم ہو جائے کہ وہ جو ہندوؤں اور مسلمانوں وغیرہ میں '' بزرگ'' کہلاتے ہیں اور مقطع شکل رکھتے اور ہاتھ میں تسبیح لے کر '' سبحان اللہ'' ، ''سبحان اللہ'' پڑھا کرتے ہیں جب اُن کے ساتھ تم تنہائی میں ہوتے ہو اور اُن کے منہ سے مسیحیوں وغیرہ کو گالیاں نکالتے سُنتے ہو تو معلوم کر جاؤ کہ وہ کس قسم کے آدمی ہیں ؟ اور سچے مسیحیوں سے بھی رفاقت کر کے معلوم کرنا کہ اُن کے اندر سے دشمنوں اور موذیوں کے لئے کیا نکلتا ہے، محض خیر اندیشی اور دعا ہے۔ یہ مسیحی دین کی پاک تاثیر ہے جو اُن پر ہوئی ہے اور وہ جو اُن غیر مذہب کے بزرگوں کی کیفیت ہے وہ بھی اُن کے دین کی تاثیر سے ہے۔ اس سے ثابت کر سکتے ہو کہ دینِ حق کی تاثیر کیسی ہے ؟

۸۔ قسم انسان کو خُدا کے سوا غیر شے کی قسم کھانا عقلاً و شرعاً حرام ہے۔ وہ جو کہا کرتے ہیں کہ مجھے اپنے پیر کی قسم یا اپنے سر و جان و اولاد کی قسم وغیرہ یہ سب گناہ کرتے ہیں۔ بُت پرستوں سے ایسی قسموں کا رواج جاری ہوا ہے۔ وہ جو ایسی قسمیں کھاتے ہیں ظاہر کرتے ہیں کہ یہ چیزیں اُنہیں زیادہ پیاری ہیں اور اُن کے گمان میں یہ بڑی چیزیں بھی ہیں۔ لیکن فی الحقیقت خُدا بڑا ہے اور وہی سب چیزوں سے زیادہ محبوب ہونا چاہئے۔

پس خُدا کے سوا غیر چیز کی قسم کھانا بے ایمانی ہے اور خُدا کا حق غیر کو دینا ہے۔ پس حاصل کلام یہ ہے کہ صرف خُدا کی قسم کھانا چاہئے اور سوا خُدا کے اور کسی چیز کی قسم کھانا حرام اور ناجائز ہے۔ لیکن خُدا کی قسم بھی بار بار کھانا اور اُسے تکیہ کلام بنا رکھنا خُدا کی بے عزتی اور ٹھٹھوں میں اُڑانا ہے اور اپنے آپ کو لوگوں کی نظروں میں بے اعتبار کرنا ہے۔ سخت ضرورت کے وقت آدمی سچائی اور سنجیدگی سے خُدا کی قسم کھا سکتا ہے۔ ورنہ ہر حال میں جب وہ بولتا ہے تو اُس کی ہاں اور نہیں بمنزلہ قسم کے معتبر ہونا چاہئے۔

ف۔ خُدا تعالیٰ نے بھی اپنے پاک کلام میں ابرہام و داؤد سے اپنی ذات پاک کی قسم کھا کے بات کی ہے اور وہ بڑی بھاری بات تھی۔ چنانچہ تم خود اُس بیان کو پیدائش ۲۲: ۱۶؛ زبور ۸۹: ۳ میں دیکھ سکتے ہو۔ قرآن شریف ظاہر کرتا ہے کہ خُدا نے اپنی چند مخلوق چیزوں کی قسمیں کھائی ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ بات خُدا کی شان سے بعید ہے کہ وہ ان مخلوق چیزوں کی قسم کھائے اور ان فانی چیزوں کو اپنی بات کی صداقت میں پیش کرے۔ یہ خیال جو قرآن شریف میں ہے انسان کی تجویز ہے خُدا سے نہیں ہے۔

۹۔ غیبت یعنی پیٹھ پیچھے لوگوں کے حق میں بُری باتیں بولنا یا اُن کی تحقیر کرنا، اُن پر ہنسنا، اُن کا نقصان کرنا۔ یہ بد آدمی کا کام ہے۔ بھلے لوگ جیسے سامنے ہوتے ہیں ویسے ہی پیچھے بھی رہتے ہیں۔ یہ غیبت بڑی فساد کی صورت ہے۔ یہ کبھی مخفی نہیں رہتی۔ ظاہر ہو جاتی ہے اور اُس کے کان تک بھی جا پہنچتی ہے جس کے حق میں وہ ہوئی۔ تب اُس کا دل خراب ہو جاتا ہے اور دشمنیاں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ جو غیبت کیا کرتا ہے دانشمندوں کی نگاہ میں حقیر ہے۔ وہ خود اُس سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ اس خیال سے کہ یہ آدمی اُس شخص کی غیبت ہمارے سامنے کرتا ہے ہماری غیبت کہیں اَور جا کے کرے گا۔ یہ نالائق ہے اس سے ہوشیار رہنا چاہئے۔ پس غیبت سے کیا ہوتا ہے؟ اپنے بھائی کا نقصان، خُدا کا گناہ اور دانشمندوں کے سامنے خود ذلیل ہونا ہے۔ اس لئے مناسب ہے کہ کوئی کسی کی غیبت نہ کرے بلکہ جو کچھ کہنا ہو اُس کے منہ پر صاف صاف کہے۔ یہ صفائی کی بات ہے اور اُس کا جواب بھی اُس سے سُنے۔ شریروں کی مجلسوں میں غیبت کرنے والے اور غیبت سننے والے لوگ اکثر جمع ہوا کرتے ہیں اور اس قسم کے بہت چرچے وہاں ہوتے ہیں۔ بعض لوگوں کو غیبت سُننے میں اور بعض کو غیبت کرنے میں مزہ آتا ہے۔ اس کا سبب یہی ہے کہ اُن کے دلوں میں شیطان رہتا ہے۔

۱۰۔ نفاق اس لفظ کے معنی ہیں "بظاہر دوستی اور بباطن دشمنی"۔ خالص دوستی کی خوشبو اور نفاقی دوستی کی بدبو ہرگز چھپی نہیں رہتی۔ میں اپنے اُن دوستوں کو خوب پہچانتا ہوں جو مجھ سے خالص دوستی رکھتے ہیں اور اُن کو بھی نام بنام جانتا ہوں جو مجھ سے نفاقی محبت رکھتے ہیں اور یہ میں نے کیونکر جانا ہے صرف اسی سے کہ بعض کی دوستی میں سے خلوص کی اور پاک نیت کی خوشبو دماغ تک پہنچی ہے اور بعض کی دوستی میں سے نفاق کی بو آگئی ہے۔ تب میں بھی اُن کی طرف سے ہوشیار ہو گیا ہوں۔ اُن کے لئے دعا کرتا ہوں کہ خُدا اُن کے دلوں کو پاک کرے اور اُن کے پھندوں سے بچنے کے لئے ہر وقت ہوشیار رہتا ہوں اور میں خیال کرتا ہوں کہ اور لوگ بھی اس طرح اپنے خالص اور نفاقی دوستوں کو پہچانتے ہونگے۔ نفاقی دوست دشمنوں سے زیادہ بُرے ہیں اور بڑے نقصان کا باعث ہیں۔ چاہئے کہ کوئی آدمی اپنی روح میں نفاق کو جگہ نہ دے۔

۱۱۔ بدگمانی، بدگوئی، ایذارسانی، الزام لگانا، بے حیائی، بددیانتی، بے ایمانی، بسیارخوری (بسیارخور۔ بہت کھانے والا، پیٹو)، باطل عقائد، بُت پرستی، قبرپرستی، پیرپرستی، بے انصافی، تعصب، خصومت (عداوت۔ دشمنی)، خودغرضی، دُزدی (چوری)، دروغ گوئی، دغا، ریاکاری، شراب خوری، سُستی، ظلم، عیاشی، ناشکری، نافرمانی وغیرہ۔ یہ سب کام غلبہ حیوانیت کے سبب سے ہوتے ہیں جبکہ نفس ناطقہ اپنا کام پس انداخت کر کے رُوح حیوانی کا مطیع ہو جاتا ہے۔ یہ سب جسم کے کام کہلاتے ہیں۔ یہ رُوح کے کام نہیں ہیں اور رُوح انسانی جب جسم کی تابع ہو رہتی ہے تو ان سب کاموں سے وہ ملامت کے لائق ٹھہرتی ہے۔

دفعہ ۲۴

انسانی جسم کے ناموں کا بیان

تمام دنیا کی زبانوں میں جسم کے کچھ ایسے نام ملتے ہیں جو رُوح انسانی کو جسم سے جدا ظاہر کرتے ہیں اور یہ بات بھی غور طلب ہے کلام اللہ میں انسانی جسم کے لئے چھ نام مذکور ہیں۔ پیدائش ۲:۷ میں جسم کو ''مٹی''، ایوب ۴:۱۹ میں اُسے ''مٹی کا مکان''، (ایوب ۱۰:۱۱) میں جسم کو ''چمڑا، گوشت، ہڈی اور نسیں''، ۲۔ کرنتھیوں ۵:۱ میں جسم کو ''خیمہ کا گھر''، ۲۔ کرنتھیوں ۴:۷ میں جسم کو ''مٹی کا برتن''، ۲۔ پطرس ۱:۱۳ میں اُسے ''خیمہ'' بیان کیا گیا ہے۔ ان ناموں میں بدن کو ''مکان'' اور رُوح کو ''مکیں'' ظاہر کیا ہے جس سے بدن اور رُوح میں صاف صاف فرق دکھایا گیا ہے۔ پھر جب رُوح بدن سے نکل جاتی ہے تو اس جسم کا نام ''لاش'' ہوتا ہے اور لفظ ''لاش'' کی اصل ''لاشی'' یعنی ''کچھ چیز نہیں ہے'' کیونکہ شے وہی تھی جو اُس میں سے نکل کے چلی گئی ہے۔

دفعہ ۲۵

رُوح انسانی کی صفات کے بیان میں

امثال ۲۰:۲۷ میں ''آدمی کی رُوح (ضمیر)'' کو ''خُداوند کا چراغ'' کہا گیا ہے کیونکہ اس تمام کارخانہ بدنی میں روشنی بخش چیز رُوح ہے۔ متی ۶:۲۳ میں خُداوند مسیح نے فرمایا ہے کہ ''۔۔۔ اگر وہ روشنی جو تجھ میں ہے تاریکی ہو جائے تو تاریکی کیسی بڑی ہو گی''۔ یہ اُسی روحانی روشنی کا ذکر ہے۔ ۱۔ کرنتھیوں ۲:۱۱ میں لکھا ہے کہ '' کیونکہ انسانوں میں سے کون کسی انسان کی باتیں جانتا ہے سوائے انسان کی اپنی رُوح کے جو اُس میں ہے؟ اسی طرح خُدا کے رُوح کے سوا کوئی خُدا کی باتیں نہیں جانتا''۔ پس انسانی رُوح میں علمی روشنی ہے اپنی نسبت۔

تب یہ رُوح انسانی ایک روشنی سی ہے جس میں زندگی ہے اور اُس میں حِس، اِدراک، ارادہ اور قوت بھی ایک حد میں ہے۔ مصنوعات کی طرف دیکھ کے رُوح انسانی جو صانع کا سراغ لگاتی ہے۔ اس کا یہی سبب ہے کہ اُس میں خُدا کی طرف سے یہ استعداد رکھی ہوئی۔ رومیوں ۱: ۲۰ میں لکھا ہے کہ ''اُس کی اَن دیکھی صفتیں یعنی اُس کی ازلی قدرت اور الوہیت دنیا کی پیدائش کے وقت سے بنائی ہوئی چیزوں کے ذریعے سے معلوم ہو کر صاف نظر آتی ہیں۔ یہاں تک کہ اُن کو کچھ عذر باقی نہیں''۔ یہ علم کس کو حاصل ہوتا ہے'' انسان کی رُوح'' کو؟ نوحہ ۳: ۲۴ میں ہے کہ ''میری رُوح (جان) نے کہا میرا بخرہ خداوند ہے''۔ وہ ایسا کیوں کہتی ہے ادراک کے سبب سے اور اُس کی خاص مہربانی اپنی طرف معلوم کر کے۔ آستر ۴: ۱۴ میں بیان ہے کہ ''۔۔۔ خلاصی اور نجات یہودیوں کے لئے کسی اَور جگہ سے آئے گی''۔ یہ کون کہتا تھا؟ اُس کی انسانی رُوح، اُس ادراکی استعداد سے جو اُس میں تھی۔ زبور ۱۳۹: ۱۴ میں زبور نویس کہتا ہے کہ ''۔۔۔ میرا دل اسے خوب جانتا ہے''۔ یہ یقین کیونکر پیدا ہوا؟ روحی ادراک سے۔ امثال ۲۳: ۳ میں ''دغا کے کھانے'' کا بیان ہے اور امثال ۶: ۳۰ میں ''بھوکے چور کو حقیر نہ جاننا'' لکھا ہوا ہے۔ یہ سب ہدایتیں روحی استعداد ادراکی سے ہیں۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کی روح نیکی پر آفرین اور بدی پر نفرین کرتی ہے، ظلم سے ایذا پاتی ہے، انصاف سے خوش ہوتی ہے اور فانی خوشی سے آسودہ نہیں ہوتی۔ یہ سب کچھ اس کی ذاتی استعداد کے سبب سے ہے۔

دفعہ ۲۶

انسانی روح غیر فانی ہے

عبرانیوں ۱۲: ۹ میں لکھا ہے کہ خدا ''روحوں کا باپ'' ہے۔ زکریاہ ۱۲: ۱ میں ہے کہ ''خداوند انسان کے اندر اس کی روح پیدا کرتا ہے''۔ گنتی ۱۶: ۲۲ میں لکھا ہے کہ ''خدا سب بشر کی روحوں کا خدا ہے''۔ اسی طرح کے بہت سے اور حوالہ جات میں بھی بیان ہے کہ انسانی روح خدا کی طرف سے ہے اور اُسی کی طرف واپس لوٹ جاتی ہے مثلاً ''جانیں جو میں نے بنائیں'' (یسعیاہ ۵۷: ۱۶)، ''تو ان کا دَم روک لیتا ہے اور یہ مر جاتے ہیں'' (زبور ۱۰۴: ۲۹)، ''وہ اپنی روح اور اپنے دَم کو واپس لے لے۔ تو تمام بشر اکٹھے فنا ہو جائیں گے'' (ایوب ۳۴: ۱۴، ۱۵)، ''اس وقت خاک خاک سے جا ملے گی جس طرح پہلے ملی ہوئی تھی اور روح خدا کے پاس لوٹ جائے گی جس نے اسے دیا تھا'' (واعظ ۱۲: ۷)۔

ان آیتوں سے یہ بات ثابت ہے کہ انسان کی روح میں اور خدا میں ایک خاص قسم کا علاقہ ہے اور کہ جب انسان مر جاتا ہے تو اس کا بدن خاک میں مل جاتا ہے اور اس کی روح اللہ کے پاس چلی جاتی نیست نہیں ہو جاتی۔

دفعہ ۲۷

انسان کی روح مجبور نہیں آزاد ہے

پیدائش ۳:۲۲ میں لکھا ہے ''۔۔۔ایسا نہ ہو کہ وہ اپنا ہاتھ بڑھائے اور حیات کے درخت سے بھی کچھ لے کر کھائے اور ہمیشہ جیتا رہے'' کیونکہ آدم مجبور نہ تھا۔ وہ ارادہ اور فعل میں آزاد تھا۔ بائبل مقدس کے بیشتر حوالہ جات سے انسان کی اس آزادی کا ثبوت ملتا ہے۔ ا۔ پطرس ۲:۱۶ میں لکھا ہے کہ ''اور اپنے آپ کو آزاد جانو مگر اس آزادی کو بدی کا پردہ نہ بناؤ''۔ زبور ۱۱۰:۳ میں ہے کہ ''لشکر کشی کے دن تیرے لوگ خوشی سے اپنے آپ کو پیش کرتے ہیں'' ۔'' اپنی مستعد رُوح سے مجھے سنبھال'' (زبور ۵۱:۱۲)، ''جہاں کہیں خُداوند کا رُوح ہے وہاں آزادی ہے'' (۲۔ کرنتھیوں ۳:۱۷)، ''میری رُوح انسان کے ساتھ ہمیشہ مزاحمت نہ کرتی رہے گی'' (پیدائش ۶:۱۔۴)۔ اس لئے کہ وہ آزاد ہے اور کبھی کبھی اللہ کی رُوح کی ہدایت کو بھی نہیں مانتا اور اپنے منصوبوں کی طرف جاتا ہے۔ یہ سزا اور جزا اسی آزادی پر مرتب ہے اور گناہوں پر ملامت کا اور ہدایت کا طریقہ اسی سبب سے جاری ہے کہ آدمی آزاد پیدا ہوئے ہیں۔ وہ ہر گز کسی تقدیر کے مجبور نہیں ہیں۔ اور خُدا کی مرضی یہ ہے کہ سب آدمی اپنی آزادی کے ساتھ اپنی خوشی سے اُس کے تابع فرمان ہوں۔

ف۔ جس خُدا نے آدمیوں کو آزاد پیدا کیا کیا عقل مانتی ہے کہ اُس کی طرف سے کوئی جبری شرع آدمیوں کے لئے نکلے کہ ضرور کلمہ پڑھو یا جزیہ دو یا مارے جاؤ؟

دفعہ ۲۸

رُوح انسانی میں ہمیشہ دو طرفہ توجہ ہے

ہر آدمی اپنے آپ کو ایک شخص موجود سمجھتا ہے اور میں بولتا ہے اور دنیا کی چیزوں کی طرف بھی متوجہ ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ میں یقیناً قائم بالذات نہیں ہوں۔ کسی دوسرے کے ہاتھ میں میری زندگی ہے اور یہ دوسرا وہی ہے جو قائم بالذات اور جہان کا مالک ہے۔ پس انسانی رُوح ہر دو طرف دیکھتی ہے۔ اپنی طرف اور خُدا کی طرف اور اس کی یہ دونوں توجہات اُس کی ذاتی خصلتیں ہیں۔

دفعہ ۲۹

انسانی رُوح جب گناہ میں ہے، مردہ ہے، مسیح اُسے جلاتا ہے

ایسا ''مردہ'' نہیں کہ بے حس و حرکت مثل لاش کے ہو مگر موت کے سایہ میں ہے اور موت کا زہر اُسے چڑھا ہوا ہے۔ اسی لئے خُدا کے کلام میں بے ایمانوں اور بدکرداروں کو'' مردہ ''کہا گیا ہے ۔''یسوع نے اس سے کہا تو میرے پیچھے چل اور مردوں کو اپنے مردے دفن کرنے دے''(متی ۸:۲۲)، ''اور اُس نے تمہیں بھی زندہ کیا جب اپنے قصوروں اور گناہوں کے سبب سے مردہ تھے''(افسیوں ۲:۱)،''جب قصوروں کے سبب سے مردہ ہی تھے تو ہم کو مسیح کے ساتھ زندہ کیا''(آیت ۵)،'' ۔۔۔اے سونے والے جاگ اور مردوں میں سے جی اُٹھ ''(افسیوں ۵:۱۴)، ''۔۔۔گناہ کے سبب سے موت آئی اور یوں موت سب آدمیوں میں پھیل گئی اس لئے کہ سب نے گناہ کیا''(رومیوں ۵:۱۲)،'' جسمانی نیت موت ہے''(رومیوں ۸:۶)۔

یہ مردہ روحیں جب تک کہ آدمیوں کے بدنوں میں ہیں اُن کا علاج ہو سکتا ہے کہ موت ان میں سے نکل جائے اور زندگی آجائے اور پھر وہ ابد تک زندہ رہیں۔ لیکن یہ کام صرف یسوع مسیح سے اور اُس کی رُوح سے ہوتا ہے اور یہی بات مسیحی دین کی بڑی فضیلت ہے۔ دنیا میں اَور کوئی تدبیر دفع موت کے لئے نہیں ہے مگر صرف یسوع مسیح کا نام ہے جس سے لاکھوں کروڑوں آدمیوں کی روحوں میں سے موت نکل گئی ہے اور زندگی آگئی ہے۔

جب سچے مسیحی بنتے ہیں تب گناہ دل میں سے نکلتا ہے اور موت رُوح میں سے نکلتی ہے۔ اندھیرا دفع ہوتا ہے اور گناہ کا وبال مسیحی کفارہ سے جاتا رہتا ہے اور جب فرمانبردار ہو کے مسیح کے پیچھے ہو لیتے ہیں تب اُس کے نور سے منور ہوتے ہیں اور مسیح کی رُوح سے ہماری روحوں میں زندگی آجاتی ہے۔ تب ہم خُدا کی عبادت رُوح اور راستی سے کرتے ہیں (یوحنا ۴:۲۴)۔

تو بھی جب تک دنیا میں ہیں جسم فانی میں اور جنگ روحانی میں پھنسی ہیں۔ لیکن دلوں اور خیالوں میں روشنی اور آنند ہے۔ آئندہ کو فرشتوں کی مانند ہونگے (لوقا ۲۰:۳۶)۔ بقا اور جلال اور قدرت اور روحانی جسم خُدا سے پائیں گے۔ فنا اور حقارت ناتوانی اور نفسانیت جاتی رہے گی (۱۔ کرنتھیوں ۱۵:۴۲۔۴۴) ،بلکہ ہم مسیح کی مانند ہونگے (۱۔ یوحنا۳:۲) ،خدا کے بیٹے کے ہمشکل ہونگے (رومیوں ۸:۲۹)، آسمانی صورت پائیں گے (۱۔کرنتھیوں ۱۵:۴۹)، ہمارے خاکی بدن بھی اُس کے جلالی جسم کی مانند ہونگے (فلپیوں ۳:۲۱) اور ہم جلال میں ظاہر ہونگے (کلسیوں ۳۔۴)۔

ان باتوں کا یقین ہمیں اِس لئے ہے کہ ہم نے مسیح سے اپنی روحوں میں اس وقت بطور بیعانہ کے کچھ پایا ہے۔ اور کہ ہم مسیح کو پہچان گئے کہ وہ کون ہے؟ اور کہ اُس کی قوت سے بھی آگاہ ہو گئے ہیں اور اُس کا کلام حق ثابت ہو چکا ہے اور جب کہ یہ سب باتیں امور واقعی ہیں تو ثابت ہے کہ ہماری رُوحوں کی اصلیت ملکی ہے کہ ہم اپنی تکمیل فرشتوں کی مانند ہونے میں دیکھتے ہیں۔

دفعہ ۳۰

آدمیوں کی روحوں پر کچھ اندھیرا سا ہے جس کے چار مخزن ہیں

نہ سب آدمیوں کی روحوں پر مگر اکثروں کی روحوں پر۔ہاں وہ جو اَب منور نظر آتے ہیں پہلے اُن کی روحوں پر بھی اندھیرا تھا۔اُن کو مسیح نے اب روشن کیا ہے۔اِس میں کچھ شک نہیں کہ بہت سی روحوں میں اندھیرا ہے۔لیکن یہ اندھیرا کہاں سے آگیا ہے؟ یہ قابلِ غور بات ہے۔

اولاً یہ دیکھتے ہیں کہ آدمی کے اندر سے اندھیرا نکلتا ہے۔جب آدمی اپنی خواہشوں اور بد منصوبوں اور خود غرضیوں وغیرہ کا مغلوب ہو کے برے کام کرتا ہے تو یہ اندھیرا اُسی کے اندر سے نکلتا ہے۔"۔۔۔کیونکہ انہوں نے اپنے غضب میں ایک مرد کو قتل کیا۔اور اپنی خود رائی سے بیلوں کی کونچیں کاٹیں"(پیدائش ۴۹:۶)۔"۔۔۔اور اپنی جان سے کہوں گا اے جان! تیرے پاس بہت برسوں کے لئے بہت سا مال جمع ہے۔چین کر اور کھاپی۔خوش رِہ"(لوقا ۱۲:۱۹)۔دیکھو یہ سب اندھیرے کی باتیں ہیں اور انسان کے اندر سے نکلتی ہیں۔

ثانیاً خارج میں بہکانے والے بھی ہیں۔شریر دوست،بدکار ہم نشین اور بد نمونے جو دنیا میں نظر آتے ہیں اندھیرے کا باعث ہیں۔

ثالثاً ایک اور پوشیدہ بد روح ہے جو انسان کی دشمن ہے جس نے حوّا کو بہکایا تھا(پیدائش ۳:۱۳)اور یہی بد روح انسان پر غالب آکے دنیا میں ایسی مسلط ہو گئی ہے کہ مسیح نے اُسے اس "جہان کا سردار" اور پولس رسول نے اُسے اس "جہان کا خدا" کہا ہے۔کیونکہ وہ بد ارادے لوگوں کے دلوں میں پیدا کرتا ہے اور بہتوں سے اپنی پرستش کراتا ہے۔اُس کا نام شیطان ہے۔اُس نے بہت سا اندھیرا لوگوں کی روحوں میں ڈال رکھا ہے۔انجیل شریف میں لکھا ہے "یعنی ان بے ایمانوں کے واسطے جن کی عقلوں کو اس جہان کے خدا نے اندھا کر دیا ہے تاکہ مسیح جو خدا کی صورت ہے اُس کے جلال کی خوشخبری کی روشنی اُن پر نہ پڑے"(۲۔کرنتھیوں ۴:۴)۔وہ لالچ دیتا ہے اور باطن میں تاثیر کرتا ہے(متی ۴:۸)۔

رابعاً جب آدمی گناہ پر گناہ کرتا چلا جاتا ہے اور خُدا کی ہدایتوں کے تابع نہیں ہوتا ہے تب ایک وقت ایسا آجاتا ہے کہ خُدا اُس آدمی کو چھوڑ دیتا ہے۔مہربانی اور فضل کو اس کی طرف سے ہٹالیتا ہے۔تب اُس آدمی کے دل پر بڑا اندھیرا سا آجاتا ہے اور وہ سنگدل ہو جاتا ہے۔یہاں تک کہ ہلاک ہو جائے۔فرعون اور حسبون کا حال ایسا ہی ہوا اور ہر زمانہ میں گردن کش شریر جو خُدا کی طرف آنا نہیں چاہتے اور ہمیشہ ہدایت الٰہی کی تحقیر کرتے اور بجائے الٰہی ہدایتوں کے اپنے دل سے خیال نکالتے ہیں اور جھوٹی راہوں کے حمایتی ہو رہتے ہیں۔اسی طرح خُدا سے چھوڑے جاتے ہیں اور فرعون بے سامان ہو کے مرتے ہیں۔ہمارے دیکھتے دیکھتے کئی ایک ہمارے دوست خُدا سے چھوڑے گئے۔اُن کی طرف سے روشنی ہٹ گئی اور وہ سخت تاریکی میں پھنس کے ہلاک ہو گئے۔اس لئے مناسب اور فرض ہے کہ ہم ان اندھیرے کے چار مخزنوں سے خبردار ہیں۔

دفعہ ۳۱

خُدا تعالیٰ ہمارا نشانہ ہے

یعنی وہ چیز جس کی طرف آدمیوں کو ہمیشہ تاکنا چاہئے کہ اُس کی مشابہت ہو کے اپنے کمال کو پہنچیں خُدا تعالیٰ ہے اور اس سے ہماری روحوں کی شان ظاہر ہوتی ہے کہ وہ کس رتبہ کی ہیں؟ اگرچہ خُدا تعالیٰ کے کام دنیا میں کچھ نظر آتے ہیں مگر اُس کی ذات پاک غیر مرے یا نادیدنی ہے۔ یسوع مسیح خُدا کی صورت ہے۔ وہ نادیدہ خُدا کو اپنی ذات میں دکھاتا ہے اور یوں ہدایت کرتا ہے کہ " تم کامل ہو جیسا تمہارا آسمانی باپ کامل ہے" (متی ۵: ۴۸)۔ آدمی اس سے کامل ہوتا ہے کہ خُدا کی صفتوں کا مظہر بنے۔ اس طرح سے کہ خُدا کی طرف بدل و جان متوجہ ہو اور اپنے مزاج کو اُس کے مزاج کے مشابہہ کرنے میں کوشش کرے۔ خُدا نیک، پاک، حلیم، صابر، بردبار، غیور، رحیم، منصف اور عادل وغیرہ صفتوں کے ساتھ موصوف ہے اور یہ سب صفتیں کامل طور پر اس میں ہیں اور یہی صفات ہیں جن سے آدمی لائق ہوتا ہے۔ اگر یہ صفتیں انسان میں نہ ہوں تو وہ آدمی بڑا نالائق اور نفرتی ہوتا ہے۔ اس بیان سے سمجھ لو کہ ہماری روحوں میں اور خُدا میں کیا علاقہ ہے؟ لیکن اس بات کا لطف انسان پر اُس وقت کھلتا ہے کہ وہ گناہ کے نشے سے ہوش میں آتا ہے۔ تب کہتا ہے کہ میں اپنے باپ پاس جاؤں گا (لوقا ۱۵: ۱۷، ۱۸)۔ کلام اللہ میں خُدا تعالیٰ کی نسبت تین خاص باتوں کا ذکر ہے۔

اوّل خُدا رُوح ہے (یوحنا ۴: ۲۴)۔

دوم خدا نور ہے اور اُس میں تاریکی ذرہ بھر بھی نہیں (۱۔یوحنا ۱: ۵)۔

سوم خُدا محبت ہے (۱۔یوحنا ۴: ۱۶) ۔

اور انسان کے اعلیٰ فرائض بھی یہی تین ہیں کہ آدمی اپنی رُوح سے خُدا کے سامنے جھکے اور الٰہی نور کی روشنی میں چلے پھرے اور یہ کہ خُدا کی محبت اور برادرانہ محبت کے احاطہ میں ہر وقت رہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ وہ جو خُدا تعالیٰ کی خاص خوبی ہے اُسی میں قائم رہنا انسان کی خوبی ہے۔

ایک قسم کے آدمی ہیں جن کو کلام خدا میں "خدا" کہا گیا ہے مجازاً دیکھو۔ "میں نے کہا تھا کہ تم خُدا (الٰہ) ہو" (زبور ۸۳: ۶)۔ یوحنا ۱۰: ۳۴۔۳۵ میں لکھا ہے کہ "۔۔۔۔ میں نے کہا کہ تم خدا ہو؟ جب کہ اُس نے اُنہیں خدا کہا جن کے پاس خُدا کا کلام آیا"۔ یہ وہی کلام ہے جس کا ذکر (یوحنا ۱: ۱) میں ہے کہ "ابتدا میں کلام تھا اور کلام خُدا کے ساتھ تھا اور کلام خُدا تھا"۔ یہ یسوع مسیح کی نسبت لکھا ہے جو مجسم ہو کے ظاہر ہے۔ وہ اندیکھے خُدا کی صورت ہے۔ جب وہ آدمی کے دل میں آتا ہے تو آدمی کو خُدا کی صورت میں اور الٰہی طبیعت اور مزاج میں لاتا ہے اور آدمی اتنا بڑا خطاب پاتے ہیں۔ بائبل کی عبارت کو جو " کلام اللہ" کہا گیا ہے اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ اُس کا کلام ہے (یوحنا ۱۴: ۲۳) اور یہ زندگی کا کلام ہے جو اُسی سے آتا ہے اور جب یہ عبارتی کلام دل میں آتا ہے، تو وہ آتا ہے، جس کا وہ کلام ہے۔ آدمی جو پیدا ہوتا ہے روحانی نہیں بلکہ جسمانی پیدا ہوتا ہے۔ پھر ایک خاص وقت بعض آدمیوں پر ایسا آتا ہے کہ وہ جسمانی سے روحانی ہو جاتے ہیں جبکہ تولید جدید اُن کی رُوحوں میں ہوتی ہے (۱۔کرنتھیوں ۱۵: ۴۵، ۴۶) اور جب یہ ہوتا ہے تو انسان کی رُوح موت سے گزر کے زندگی میں آجاتی ہے (۱۔یوحنا ۳: ۱۴)۔

دفعہ ۳۲

نیند اور غنودگی کے بیان میں

نیند ایک حالت ہے ہر ایک حیوان کو عارض ہوتی ہے۔ اُس میں یہ سب حواس کچھ معطل سے ہو جاتے ہیں اور غیر ضروری حرکات چھوڑ دیتے ہیں صرف ضروری حرکتیں مثلاً سانس لینا وغیرہ قائم رہتے ہیں۔ کیونکہ تھکان کے سبب سے لطیف ابخرے (بُخار کی جمع۔ بخارات، بھاپ) دماغ میں گھس جاتے ہیں اور حیوانی رُوح کو ایسا غلیظ کرتے ہیں کہ وہ پٹھوں میں نہیں بہتی۔ جب تک کہ نیند کا وقت پورا نہ ہو جائے یا وہ آدمی صدمات سخت سے جگایا نہ جائے۔ نیند صحت کے لئے مفید ہے اگر اپنی حد میں ہو اُس سے حیوان تروتازہ ہو کے پھر اُٹھتا ہے۔

''غنودگی'' یا ''**نوم متململ**'' ایک اور حالت ہے جو نیند اور بیداری کے درمیان ہوتی ہے جس میں حیوان کچھ سوتا ہے کچھ جاگتا ہے۔ نیند کو تشبیہً موت کی چھوٹی بہن سمجھنا چاہئے۔ بڑی بہن موت ہے جس میں تمام کارخانہ اُلٹ پُلٹ ہو جاتا ہے۔ روز روز سونا اور پھر جاگنا مر کے جی اُٹھنے کا ایک نمونہ سا ہے۔

دفعہ ۳۳

خواب کے بیان میں

کبھی کبھی سوتے وقت آدمی کچھ دیکھتے ہیں یا اُنہیں کچھ معلوم ہوتا ہے اور جب جاگتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے یہ خواب دیکھا۔ یہ تو سچ ہے کہ اُنہوں نے خواب دیکھا۔ مگر واقعات کے تجربوں سے معلوم ہوا ہے کہ یہ خواب کئی طور پر ہوا کرتے ہیں۔ چاہئے کہ ہم خوابوں کی قسموں سے بھی آگاہ ہو جائیں۔ اول '' اَضغاثِ اَحلام'' (پریشان خواب جن کی کوئی تعبیر ہو) ہیں۔ اس لفظ کے معنی ہیں '' سوکھے گھاس کے مٹھے'' ۔ خوابوں کے یہ وہ واہیات پریشان خواب ہیں جو معدہ کی خرابی سے نظر آتے ہیں جب کہ پیٹ میں قبض ہے یا کوئی ایسی غذا کھائی ہے جس سے خراب ابخرے دماغ کی طرف چڑھے ہیں۔ یا وہ شخص اپنی بدنی کیفیت اور دماغی واہمی خیالات کے موافق کچھ دیکھتا ہے مثلاً دموی مزاج (وہ شخص جس میں خون کی خِلط بڑھ جائے) آدمی اکثر خواب میں سرخ رنگ کی چیزیں دیکھتا ہے اور صفراوی مزاج (تلخ مزاج) کو آگ وانگارے نظر آتے ہیں۔ اور جب ریح (معدہ کی ہوا۔ باد) کا غلبہ ہے اور مزاج میں کچھ بادی ہے تب دیکھتا ہے کہ گویا ہوا میں اُڑتا ہوں اور احمق سمجھ لیتا ہے کہ میں شاید ولی اللہ ہو گیا ہوں۔ سوداوی مزاج (جنونی آدمی) کو پہاڑ اور دھوئیں کے غبار نظر آتے ہیں اور بلغمی مزاج (وہ شخص جس میں بلغمی خلط زیادہ ہو۔ موٹا) کو پانی کی نہریں اور بارش اور سفید رنگ کی چیزیں دکھائی دیتی ہیں۔

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دو یا چند کیفیتوں میں ترکیب ہو جاتی ہے۔ نفسانی خواہشیں اور رُوح کی بُری کیفیت اور بدنی امراض وغیرہ مل کے عجیب شکلیں پیدا کرتے ہیں۔ یہ سب واہیات خواب ہیں اور خُدا کے کلام میں ان خوابوں کو ناچیز بتایا گیا ہے۔ بھوکا اور پیاسا آدمی خواب دیکھتا ہے کہ کھاتا اور پیتا ہوں (یسعیاہ ۲۹:۸)۔ ''کیونکہ خوابوں کی زیادتی اور بطالت اور باتوں کی کثرت سے ایسا ہوتا ہے لیکن تُو خدا سے ڈر'' (واعظ ۵:۷)۔

ف۔ وہ جو دانشمند آدمی ہے وہ خوابوں کے وسیلہ سے اپنی اندرونی بگڑی ہوئی کیفیت سے خبردار ہو کے صحت اور صفائی کے درپے ہوتا ہے اور مزاج کو اعتدال پر لانے کی جلابوں وغیرہ سے کوشش کرتا ہے۔ لیکن بیوقوف آدمی کبھی کبھی ایسے خوابوں کا معتقد ہو کے اپنے دین کا اور دنیا کا بھی نقصان کر لیتا ہے۔

بعض وقت وہ مشائخ جو خلوص سے بے بہرہ ہیں اور دینداری کے لباس میں ہو کے دنیا کماتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ آج ہم نے ایک خواب دیکھا اُس کی تعبیر یہ ہے کہ یوں یوں ہو گا۔ اور ایسے لوگ نہ صرف باطل مذہبوں کے مشائخوں میں ہیں بلکہ خُدا کی جماعت کے درمیان بھی ہوتے ہیں۔ ان کی شکایت خُدا تعالیٰ نے اپنے کلام میں یوں کی ہے '' خداوند فرماتا ہے کہ دیکھ میں اُن کا مخالف ہوں جو جھوٹے خوابوں کو نبوت کہتے اور بیان کرتے ہیں اور اپنی جھوٹی باتوں سے اور لاف زنی سے میرے لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں'' (یرمیاہ ۲۳:۳۲)۔ یرمیاہ ۲۹:۸ میں ہے کہ اپنے خواب بینوں کو جو تمہارے ہی کہنے سے خواب دیکھتے ہیں مت مانو۔

ان جھوٹے اور واہیات خوابوں کا ذکر سن کے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ خواب مطلق غلط اور باطل ہی ہوتے ہیں۔ ایسی بات ہر گز نہیں ہے بلکہ **وہ جو حقیقی خواب ہیں اور خُدا کی طرف سے بعض آدمیوں کی رُوحوں پر ظاہر ہوتے ہیں برحق اور راست ہیں۔** محمدی لوگ ان کو مبشرات کہتے ہیں۔ ان میں یہ خصوصیت نہیں ہے کہ صرف نیک اور خدا پرست دیندار اور باایمان آدمی ہی دیکھتے ہیں بلکہ کافر اور بُت پرست بھی کبھی کبھی سچے خواب دیکھتے ہیں۔ دیکھو فرعون اور نبوکدنضر نے بھی جو بُت پرست لوگ تھے سچے خواب دیکھتے ہیں۔ اور فرعون کے نان پز اور ساقی نے بھی جو دیکھا تھا سچ تھا (پیدائش ۴۰:۸۔۲۰؛ ۴۱:۱۔۸؛ دانی ایل باب ۲)۔ نبوکدنضر کے خواب کا بیان کیسی تعجب کی بات ہے کہ دانی ایل نے اس کا خواب بھی بتایا اور تعبیر بھی کہی اور ویسے ہی ظہور میں آیا۔ اب کون کہہ سکتا ہے کہ وہ خواب نہ تھا خیال تھا؟ پھر دیکھو ایک آدمی بُت پرست پیلاطس کی زوجہ نے جو عدالت کے وقت اپنے شوہر کے پاس یسوع مسیح خُداوند کی نسبت اپنے خواب کی خبر پہنچائی کیسی صحیح خبر تھی؟ (متی ۲۷:۱۹)۔ دنیا میں سچے خوابوں کا وجود بھی ضرور پایا جاتا ہے۔ بعض لوگ اپنے سچی خوابوں کے ایسے معتقد ملیں گے کہ اُن کے اس اعتقاد کو کوئی فلاسفر ہر گز ہٹا نہ سکے گا۔ وہ کہیں گے کہ البتہ دنیا میں باطل خواب خیال بھی ہوتے ہیں مگر ہمارا فلاں خواب ضرور سچا تھا۔ پس اگرچہ اس کا وہ خواب سچا ہو لیکن غیر شخص کے لئے وہ سندی بات نہیں ہو سکتی ہے۔ اگر کچھ سندی بات ہے تو اُسی کے لئے ہے جس نے وہ خواب دیکھا ہے۔ کیونکہ بعض اوقات آئندہ واقعہ کا عکس ہو سکتا ہے کہ کسی آدمی کے دل پر گرے اور مدبر عالم کے ارادہ سے گرے جبکہ خُدا کوئی بات کسی پر ظاہر کرنا چاہے۔

لیکن آدمیوں کی نجات کے بارے میں جو تعلیم ضروری تھی وہ سب پیغمبروں اور صاحبان الہام کے وسیلہ سے بائبل شریف میں خُدا کی طرف سے بیان ہو چکی ہے اور کامل ثبوت کو پہنچ گئی ہے اور یہ کام ختم ہو گیا ہے۔ اب جو کچھ اس بارے میں کوئی آدمی بائبل کے خلاف کہے گا وہ ہر گز خُدا سے نہ ہو گا۔ ''اگر ہم یا آسمان سے کوئی فرشتہ سوائے اُس انجیل کے جو ہم نے سنائی دوسری انجیل تمہیں سنائے سو ملعون ہو'' (گلتیوں ۱:۸)۔

یہ اور بات ہے کہ کوئی کہے میں نے ایک خواب دیکھا ہے فلاں شخص پر کوئی آفت یا برکت آتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ شاید ایسا ہو دیکھا جائے گا۔ جب ویسا ہو تو کہہ سکتے ہیں کہ تمہارا خواب سچا تھا۔ لیکن ہمیں اور تمہیں دونوں کو کلام اللہ کا مطیع ہونا ضرور ہے نہ خواب خیالوں کا۔

دفعہ ۳۴

پیغمبروں اور مومنین کے خواب کا بیان

چونکہ یہ لوگ بھی انسان ہیں۔ اُنہیں بھی بد ہضمی اور بیماری وغیرہ اسباب سے باطل خیال آسکتے ہیں اور آتے بھی ہیں۔ مگر ان لوگوں کے وہ خاص خاص خواب جو کلام اللہ میں مذکور ہیں الہام کی قسم سے ہیں۔ اس لئے اُن کے اُن خوابوں کو حقیقی خواب ماننا واجب ہے۔

دیکھو کیا لکھا ہے "خواب میں رات کی رویا میں جب لوگوں کو گہری نیند آتی ہے اور بستر پر سوتے وقت۔ تب وہ لوگوں کے کان کھولتا ہے اور اُنکی تعلیم پر مہر لگاتا ہے" (ایوب ۳۳: ۱۵، ۱۶)۔

اب سوچئے کہ یہ تعلیم درست ہے یا نہیں۔ تجربہ سے یقین ہے کہ درست ہے۔ اُس وقت آدمی کے حواس معطل سے ہوتے ہیں تو بھی اُس کی رُوح کچھ سنتی، کچھ دیکھتی، کچھ سیکھتی ہے۔ اگر رُوح انسانی ایک مستقل جوہر نہ ہوتا تو ایسا معاملہ کس طرح ہو سکتا تھا؟

(ایوب ۴: ۱۲۔۲۱ پڑھو) دیکھو جب وہ سوتا تھا اور آنکھیں بند تھیں حواس معطل تھے تب اس کی رُوح نے ایک اَور رُوح کو دیکھا اور اُس سے متاثر ہوئی اور ایک آواز بھی سُنی اس حالت میں جو دیکھنا اور سُننا ہوا نفس ناطقہ سے بلا توسط حواس ظاہری کے ہوا۔ (گنتی ۱۲: ۶۔۹) خُدا تعالیٰ نبی کو اپنے تین رویا میں معلوم کراتا ہے اور اُس سے باتیں کرتا ہے اور موسیٰ سے آمنے سامنے بولتا ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ سچے خواب والا نبی جو بد تعلیم دے قبول نہ کیا جائے کہ وہ آزمائش کا مقام ہے (استثنا ۱۳: ۳، ۴)۔

دفعہ ۳۵

اطوار تعلیم و تعلم

انسان محض جاہل پیدا ہوتے ہیں اور پیدا ہوتے ہی اس جہان کی باتیں سیکھنا شروع کرتے ہیں اور وہ سُننے، دیکھنے، قیاس اور تجربہ سے تعلیم پاتے چلے جاتے ہیں۔ وہ بدی بھی سیکھتے ہیں اور نیکی بھی سیکھتے ہیں۔ اُن کی تعلیم کبھی پوری نہیں ہوتی کہ وہ مر جاتے ہیں اور سیکھنے کے لئے بہت کچھ باقی رہ جاتا ہے۔ اُنہیں نہ اس قدر فرصت ہے نہ اس قدر طاقت ہے کہ سب کچھ سیکھ سکیں۔

ضروری بات انسان کے لئے یہ ہے کہ وہ اپنے خالق کی مرضی کو دریافت کرے کہ وہ کیا چاہتا ہے؟ اور اُسی کے موافق اپنی زندگی بسر کر کے اِس سے رخصت ہو۔ ہاں دنیا کی اَور باتیں بھی جہاں تک وہ سیکھ سکتا ہے سیکھے اس سے بھی فائدہ ہوتا ہے۔ لیکن اعلیٰ غرض یہی ہونا چاہئے کہ وہ خُدا کی مرضی کو دریافت کرے کیونکہ بہبودی اس کی اُسی پر موقوف ہے۔ عام طریقہ تعلیم آدمیوں کے لئے اکتساب اور استفاضہ (فائدہ اٹھانا) اور فکر ہے اور یہ طریقہ حواس سے علاقہ رکھتا ہے اور پورا ہوتا ہے۔ لیکن خُدا کی مرضی اس طریقہ سے پوری پوری دریافت نہیں ہو سکتی ہے۔ اس لئے خُدا نے ایک اور طریقہ تعلیم کا دنیا میں ظاہر کیا ہے جسے ''الہام'' کہتے ہیں۔ یہ طریقہ خاص الٰہی مرضی کے اظہار کے لئے ہے اور یہ عام آدمیوں کے لئے نہیں ہے بلکہ خاص لوگوں کو بخشا گیا تھا جن کے وسیلہ سے الٰہی مرضی بائبل شریف میں قلم بند ہو گئی ہے۔ اس طریقہ سے جو تعلیم ہوتی ہے اس کے لئے الفاظ ذیل دنیا میں مشہور ہیں یعنی الہام، مکاشفہ، القا، وحی، وجد، وجدان، فیض۔

''الہام'' کے معنی ہیں کہ '' کوئی مطلب انسان کے دل میں خُدا کی طرف سے آئے جس میں اکتساب اور استفاضہ اور فکر کو اور قوت واہمہ کو دخل نہ ہو''۔

''مکاشفہ'' کے معنی ہیں '' پردہ ہٹا کے کچھ دکھانا''۔

''القا'' کے معنی ہیں '' خُدا کی طرف سے کوئی بات دل میں ڈالا جانا''۔

''وحی'' کے معنی ہیں '' خُدا کا پیغام''۔

''وجد'' کے معنی ہیں '' بوسیلہ چشم دل کے خُدا کو دیکھنا''۔

''وجدان'' کے معنی ہیں '' گم شدہ کو پانا''۔

''فیض'' کے معنی ہیں '' خُدا کی طرف سے دلوں میں برکت کا بہہ کے آنا''۔

دنیا میں بڑا مباحثہ اس بارے میں ہو رہا ہے کہ آیا یہ دو طریقے یعنی ''اکتسابی'' اور ''الہامی'' فی الحقیقت جہان میں ہیں یا نہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ صرف اکتسابی طریقہ ہے الہامی طریقہ فرضی بات ہے یا وہ مغالطہ دے کے الہامی طریقہ کو اکتسابی میں شامل کر دیتے ہیں۔ چنانچہ برہمو اور نیچریوں کا یہی حال ہے۔ یہ سب الہام کے منکر ہیں۔ اُن کی باتیں ہمیں کچھ سنجیدہ نظر نہیں آتیں اور نہ اُن لوگوں میں کچھ خیر خوبی دکھائی دیتی ہے۔ دنیا کے درمیان جس قدر خیر خوبی نظر آتی ہے وہ صرف اسی الہامی طریقہ سے نکلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے ایسے منکر ہمیں بطلان پر نظر آتے ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ ہاں الہام کا طریقہ تو موجود ہے مگر وہ عام ہے۔ ہر زمانہ میں لوگوں کو الہام ہوا کرتا ہے۔ خاص زمانہ میں خاص لوگوں پر اور خاص کتابوں میں منحصر نہیں ہے۔ یہ قول فریب کا ہے جو منکرین الہام نے قایلیں الہام کو فریب اور مغالطہ دے کے اپنے جال میں پھنسانے کے لئے بنایا ہے تاکہ اپنی واہمی باتوں کو اس زمانہ کا الہام کہہ کے اُن سے قبول کروائیں اور حقیقی الہام کو اُن سے چُھڑائیں۔ ایسے لوگوں کو منکرین الہام کہنا چاہئے۔

میں پوچھتا ہوں کہ الہام کی ہمیں ضرورت کیوں ہے؟ صرف اس لئے کہ ہم خُدا کی مرضی کو معلوم کریں کہ ہماری اُخروی اور حال کی بہبودی کیونکر ہو سکتی ہے؟ اور عقل اس بات کو قبول نہیں کرتی ہے کہ خُدا کی مرضی ہر زمانہ میں لوگوں کی نسبت بدلا کرے آج کچھ مرضی ہے اور کل کچھ اور

مرضی ہو جائے۔اُس کی ایک مرضی ہے جو اول سے آخر تک سب آدمیوں کی نسبت ہے۔ سو ایک دفعہ ایک زمانہ میں اُس کا اظہار کافی ہے۔ ہر زمانہ میں الہام کی کچھ ضرورت اور حاجت نہیں ہے۔ہاں فیض کی حاجت ہے کہ ہر زمانہ میں ہر کوئی اپنے دل میں برکت پانے کا محتاج ہے کہ الٰہی مرضی ظاہر شدہ میں مستقیم ہو۔ خُدا کی طرف سے جو پیغام آنا تھا وہ پیغمبروں کے وسیلہ سے آچکا ہے۔اُس کی مرضی ظاہر ہوگئی ہے جو بائبل میں مندرج ہے اور برکت روحانی ایمانداروں کو ہر زمانہ میں برابر ملتی رہتی ہے جس سے وہ دینداری میں قائم اور ایمان میں خوش وقت رہتے ہیں۔ **دنیا میں اہل بائبل کے سوا اور لوگ بھی ہیں جو ایک ایک کتاب لے کے اُس کے الہامی ہونے کے مدعی ہیں اس کا فیصلہ کیونکر ہو سکتا ہے؟**

ہم جانتے ہیں کہ بعض آدمیوں کو وہم بھی ہوتے ہیں کیونکہ قوت واہمہ اُن میں ہے۔بعض آدمی دھوکا بھی کھاتے ہیں کیونکہ وہ انسان ''ضعیف البنیان''(جس کی بنیاد کمزور ہو)ہیں اور دنیا میں فریب بہت ہے۔ بعض آدمیوں کو مالیخولیا بھی ہو جاتا ہے۔صفراوی غلبہ سے بعض آدمی خود بھی فریب دینا چاہتے ہیں کہ اپنی کوئی غرض پوری کریں۔ بعض آدمی بیوقوف بھی ہیں کیونکہ سب نے مناسب تعلیم نہیں پائی ہے۔ بعض آدمی شریر بھی ہیں کیونکہ اُن کے دلوں میں شر ہے۔ بعض آدمی بجائے خود نیک اور خُدا ترس اور سچے بھی ہیں اس لئے ہر مدعی کا قول بے تامل قبول کرنا یا رد کرنا مناسب نہیں ہے جب تک کہ مناسب تحقیق نہ ہو جائے۔ پس جو کوئی چاہے اُٹھے اور تحقیق کرے کہ کونسی کتاب اللہ سے ہے اور ایسی سچائی سے دریافت کرے کہ خُدا کے سامنے روسیاہ نہ ہو جائے۔ بے ایمان اور بے انصاف منصف ہو کے فیصلہ نہ کرے۔ بائبل شریف کی کیفیت کا مقابلہ سب اہل مذاہب کی کتابوں کی کیفیتوں سے بہ ہزار کوشش اور انصاف لائق آدمیوں سے ہو گیا ہے اور ثابت ہو چکا ہے کہ صرف بائبل ہی حق ہے۔ وہی خدا سے ہے۔اسی میں الہام ہے۔اسی میں انسان کے لئے زندگی اور تسلی ہے۔اسی میں روشنی ہے۔ چاہو تو باانصاف خود مقابلہ کر کے دیکھو۔

دفعہ ۳۶

اطوار تحقیقات

دنیا میں جھوٹ اور سچائی یہ دونوں موجود ہیں بلکہ جھوٹی تعلیمات بکثرت پھیلی ہوئی ہیں۔ کیا کریں کہ گمراہی سے بچیں اور غلطیوں میں سے نکلیں؟اُس کی راہ صرف یہی ہے کہ اولاً ہم ہر طرف سے نگاہ ہٹا کے اپنے دل میں اور خیال میں سچے بنیں یعنی سچائی کے سچے طالب ہوں۔

یہاں تین الفاظ ہیں جنہیں خوب یاد رکھنا چاہیئے۔اول سچائی،دوم اس کی طلب،سوم سچی طلب۔ سچائی نام ہے امر واقعی کا اور کذب کے خلاف ہے اور اپنے نمونے یا سایہ کا عین بھی ہے۔ مثلاً زید جو فی الواقع اندھا ہے اگر کہیں کہ وہ آنکھوں والا ہے تو یہ جھوٹ ہے اور جو کہیں کہ وہ اندھا ہے یہ سچائی ہے۔اس طرح اگر زید کی تصویر کو کہیں کہ یہ زید ہے یہ امر واقعی نہیں ہے۔زید فی الحقیقت وہ شخص ہے جس کی وہ تصویر ہے۔ عقلاً و نقلاً سچائی عمدہ شے ہے اور کذب مکروہ ہے۔انسان کی تمیز کو اور سب زندہ تمیز شخصوں کو اور خدا کو بھی سچ پیارا ہے۔ سچائی خدا کی صفت ہے اور

جھوٹ شیطان کی صفت ہے۔ سچائی پر الٰہی رحمت کا سایہ رہتا ہے اور جھوٹ پر خدا کے غصے کی گھٹا چھائی رہتی ہے۔ سچائی سے دل پاک اور کذب سے ناپاک ہوتا ہے۔ پس چاہیئے کہ ہم سچ بولیں اور ہر بات میں سچا انصاف کریں اور سچے خیال اپنے ذہن میں رکھیں اور ہر بات میں سچ کے طالب رہیں اور سچ کو عزت دیں اور دلوں میں محبوب رکھیں اور خود اُس میں قائم ہوں۔

ہر کوئی منہ سے تو کہتا ہے کہ سچائی خوب چیز ہے کیونکہ انسان کی تمیز ایسا کہتی ہے۔ لیکن ہر کوئی اُس کا طالب نہیں ہے، اُسے تلاش نہیں کرتا، اسکے لئے دن رات ایسا مشتاق نہیں جیسا اپنی اور غرضوں کا مشتاق ہے۔ اس کا یہی سبب ہے کہ سچائی اُس کی نظروں میں کچھ قیمتی اور عزیز شے نہیں ہے۔ وہ محاورہ کے طور پر کہتا ہے کہ سچائی خوب چیز ہے۔ ایسا آدمی سچائی کو نہ پائیگا بلکہ جھوٹ کے جال میں پھنسا ہوا مرے گا اور وہاں جائیگا جہاں جھوٹ کا باپ یعنی شیطان رہتا ہے۔ چاہیئے کہ سچائی کی طلب ہم میں ہو اور سچی طلب ہو، جھوٹی طلب سے سچائی ہاتھ نہیں آتی ہے۔ **وہ جو سچائی کا طالب ہے چاہیئے کہ پہلے اپنی جیب سے جھوٹ کو نکال کے دور پھینک دے تاکہ سچائی کا عاشق کامل ہو تب اس کا محبوب اُسے نظر آئیگا کہ کہاں ہے؟** سچائی نظر آتی ہے، سچی آنکھوں والے کو۔ پس چار چیزوں کو جو سچائی کے خلاف ہیں اپنے اندر سے نکال اور دو باتوں کو عمل میں لا۔ تب تو حق کو خوب پہچانے گا۔

اوّل بے جا طرفداری کو چھوڑ دے، حق کا طرفدار ہو۔

دوم خود غرضی کو نکال کہ یہ شیطان کی رسی ہے جو آدمیوں کو شیطان کے پاس باندھے رکھتی ہے۔

سوم کج بحثی کا طور چھوڑ دے کہ یہ شیطان کا جال ہے جس میں صدہا آدمی مگس (مکھی) سیرت پھنسے رہتے ہیں۔ بات کے مغز کی طرف متوجہ نہیں ہوتے بلکہ مغز کو پھینک دیتے اور پوست کو چبایا کرتے ہیں۔

چہارم غرور نہ کر۔ مت کہہ کہ میں بڑا عالم ہوں یا بڑا خاندانی شریف یا زیادہ نیکوکار ہوں۔

یہ سب باتیں سچائی کے خلاف اور گمراہی کی دلدل ہیں۔ غرور ایک نشہ سا ہے جو آدمی کے دماغ کو مکدر (کدورت آمیز۔ گدلا) رکھتا ہے۔ ان چار باتوں کو چھوڑ کہ جو دو باتیں تجھے عمل میں لانا لازم ہیں یہ ہیں۔

اولاً تُو اپنی روح میں خدا سے جو خالق ہے سچائی کے لئے انکشاف کا طالب ہو تاکہ تجھے غیبی مدد اوپر سے ملے۔

ثانیاً اگر تو صاحب علم ہے یا کسی قدر خواندہ شخص ہے تو تُو مخالفوں اور موافقوں کی کتابوں پر متوجہ ہو۔ اگر تو بے علم ہے اور ناخواندہ ہے تو ان دونوں قسم کے لوگوں کی باتیں بغور سُن اور جو کچھ تُو خود نہ سمجھے وہ بات جس گروہ کے لوگوں کی ہے اُسی گروہ کے لوگوں سے پوچھ کہ آپ لوگ اس بات کو کیونکر سمجھتے ہیں؟ اور دوسری جانب کے سامنے ان کا بیان پیش کر اور سب کی سُن کے یا پڑھ کے اپنی تمیز سے آپ انصاف کر۔ اور آہستگی اور نرمی سے ایک ایک بات کو سلجھا۔ بہت سی باتوں کا ہجوم اپنے سامنے نہ آنے دے کہ تیرا دماغ برداشت نہ کر سکے گا اور تیرے سامنے غوغا ہو گا اور غوغے میں حق پوشیدہ ہو جائے گا یا تُو خود دیوانہ سا ہو کے کہے گا کہ یہ تو سب جھگڑے ہیں۔ میں سب سے کنارہ ہو کے یوں یوں کروں گا تب تُو خود اپنی طرف سے ایک

گمراہی کا نکالنے والا ہوگا۔ اگر تُو ایک ایک بات کا فیصلہ آرام کے ساتھ کرے گا تو چند روز میں چند صداقتیں تیرے ہاتھ میں آجائیں گی۔ اور تیرے خیال میں عجیب روشنی کا باعث ہوں گی اور وہ جھگڑے کا بڑا جنجال تیرے سامنے حل ہو جائے گا۔ لیکن تجھے خوب معلوم ہو جائے کہ تجھے بوسیلہ اپنی تمیز کے غور سے انصاف کرنا ہے کیونکہ یہ تمیز اللہ کی طرف سے ایک روشنی ہے۔ اسی کا دوسرا نام نور فطرت ہے اور یہی پہلا ہادی انسان کے لئے خدا کی طرف سے مقرر ہے اور اُس میں تاریکی بھی چھا جاتی ہے۔ انہیں چار مکروہ چیزوں کے سبب سے جن کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے۔ جب تُو نے اُن چاروں کو اپنے اندر سے نکال ڈالا ہے تو اب تیری تمیز صاف ہو گئی ہے اور سچائی کی طرف خوب ہادی ہو سکتی ہے۔ اب ہر بات کا مناسب فیصلہ تیری ہی تمیز سے ہوگا اور تو اُس فیصلہ پر بااستحکام قائم بھی رہے گا کیونکہ تو سچائی کا طالب تھا۔

ہاں اگر تو اپنی جان کو فریب دے گا اور ان بدصفتوں مذکورہ بالا میں سے کوئی بدصفت چھپا کے اپنے دل میں رکھے گا۔ اس صورت میں تیرے فیصلہ کے درمیان اُس پوشیدہ بدصفت کی کچھ بدبو ضرور نکلے گی اور تیرا ہی دل تجھے اندر اندر الزام دیگا اور دیگر مبصران روشن ضمیر حق پسند تیرے فیصلہ میں تیری اس بدصفت کا خمیر تجھے دکھائیں گے اور تو بے انصاف ہو کے عدالت الٰہی میں سزا کا سزاوار ہوگا۔ ہزاروں آدمی ہیں جو اپنے آپ کو حق کا طالب کہتے ہیں مگر کذب کو بغل میں دبائے ہوئے ناپاک بحث کیا کرتے ہیں۔ وہ جو فی الحقیقت سچائی کے سچے طالب ہیں وہ ضرور سچائی کو پاتے ہیں۔

دفعہ ۳۷

کامل انسان کے بیان میں

کامل انسان وہ ہے جس کی انسانیت کے سب مدارج جسمانی اور روحانی پورے پورے اور ٹھیک مناسبت میں ہوں۔ یعنی اُس کی انسانیت کے کسی حصہ میں کمی بیشی نہ ہو۔ جب کہتے ہو کہ اس تھیلی میں پورے سو روپے ہیں۔ اس کے یہی معنی ہیں کہ سو سے نہ کچھ کم ہے نہ زیادہ مگر سوا کائیاں پوری ہیں۔ لفظ ''کامل'' کے معنی ہیں '' پورا''، ''بے نقص''۔ کامل انسان کے لفظی معنی ہیں وہ انسان جس کی انسانیت میں کچھ نقص نہیں۔

ہمارے ملک کے کج فہم لگ جو مرشدِ کامل کی تلاش میں ہوتے ہیں۔ وہ اکثر مرتاض (ریاضت کرنے والے) اور کچھ پرہیزگار لوگوں کو جب اُن سے کوئی اچنبھے کی بات دیکھتے ہیں کامل آدمی کہا کرتے ہیں بلکہ اپنی روح کو بھی ان کے سپرد کر دیتے ہیں جو وہ فرماتے ہیں یہ کرتے ہیں۔ کیونکہ انہیں کامل انسان مل گیا ہے اور ان کا پیر و مرشد ہوا ہے۔ یہ نہایت نازک معاملہ ہے۔ اس میں بڑی غلطیاں ہوتی ہیں۔ اکثر اندھے لوگ اس اندھے مرشد کے پیچھے چل کے اس کے ساتھ دوزخ کی غار میں جا گرتے ہیں۔ پس کامل انسان کی تعریف بغور سمجھ کے ناظرین کو ہوشیار ہونا چاہیے۔

محمدی لوگ کہتے ہیں کہ محمد صاحب کامل انسان تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان لوگوں نے کامل انسان کے مفہوم پر غور نہیں کیا ہے۔ صرف شیفتگی (عشق) کے سبب سے اور اس لحاظ سے کہ وہ ان کے پیشوا ہیں۔ انہوں نے حضرت کو کامل انسان کہہ دیا ہے۔ اب زمانہ روشنی کا ہے اور بہت کچھ صاف صاف نظر آتا ہے۔ اس لئے ہم خوب دریافت کر کے کہیں گے کہ کامل انسان کون ہے؟ کامل انسان کی وہی تعریف ہے جو اس دفعہ کی پہلی سطروں میں میں نے لکھی ہے۔ اس کو حفظ رکھنا چاہیے۔ اس کے موافق اگر کوئی شخص نظر آئے تو اس کو کامل انسان سمجھنا مناسب ہوگا۔

لفظ ''انسان'' پر بہت بحث ہو چکی ہے اور اس کا مفہوم یہی ہے کہ انسان ایک چیز ہے مرکب حیوانیت اور ملکیت سے خاکی جسم اس کا خیمہ سا ہے۔ پس چاہیے کہ جسمانی اعضا سب درست ہوں اور حیوانی قوتیں بھی مناسب صورت میں موجود ہوں اور صفات ملکیہ کی رُو یا نفس ناطقہ کی قوتیں یا صفتیں ہیں۔ سب کی سب مناسب شکل میں اور یہ کل مجموعہ بہ ترتیب مناسب قائم ہو کے اُس اپنی خاص نسبت یا علاقہ میں جو اُس کو اپنے خالق سے اپنی وضع میں ہے وہ شخص بیداغ صورت میں قائم ہو۔ وہی کامل انسان ہے۔ توضیح اُس کی یوں ہے کہ جسمانی اور حیوانی اور ملکی سب حصوں کے وجودی تکملہ کے بعد یہ بھی ضرور ہے کہ اُن میں نسبتیں بھی مناسب ہوں، نہ ان کا کوئی حیوانی صفت تعدی کر کے کسی ملکی صفت میں خلل انداز ہو۔ اور یہ بھی چاہئے کہ وہ اپنی بنی نوع اور اُن سب دنیاوی خارجی اشیاء کے درمیان بھی مناسب حالت میں رہے۔ پھر اپنے خالق کی نسبت بھی ٹھیک ہو اور عین وقت پیدایش سے موت تک ہر حال میں یہ کیفیت تم اُس میں ثابت کر سکو تو وہ کامل انسان ہو گا۔

اب بتاؤ کہ دنیا میں کون ایسا شخص کبھی ظاہر ہوا ہے؟ کس کی تاریخ ایسی ہے؟ کس کو ایسا شخص بدلیل بتا سکو گے؟ صرف ہم عیسائی لوگ دلاوری کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا خُداوند یسوع مسیح ایسا ہے کیونکہ یہ سب مدارج مذکورہ اُس میں ثابت ہیں۔ پاک تحقیق سے ہمیں یہ معلوم ہو گیا ہے کیونکہ ہم نے اُس کی تواریخ کے ہر ہر فقرے اور ہر ہر لفظ کو بغور دیکھا اور سمجھا ہے۔ اُن نکتوں اور باریکیوں کے ساتھ جو وہاں مذکور ہیں۔ اس لئے ہم کہتے ہیں کہ **یسوع مسیح کامل انسان ہے اور یہ بیان اُس کی ماہیت انسانی کا ہے۔ الوہیت کی ماہیت اس کی جدّی (آبائی۔ موروثی) بات ہے اور وہ بھی پوری خُدائی ہے۔ پس وہ کامل خُدا اور کامل انسان ہے۔** آدم بھی کامل انسان پیدا ہوا تھا اور کچھ عرصہ تک کامل رہا۔ پھر وہ کمال کے رتبہ سے گناہ کے سبب گر گیا اور اُس کی نسبتوں میں خلل آ گیا اور خلل کے سبب سے روحانی قوتوں میں اندھیرا چھا سا گیا اور سارا کارخانہ درہم برہم ہو گیا۔ تمام اولاد میں بدی اور گمراہی پھیل گئی اور لعنت کے نشان ظاہر ہو گئے اور ہم سب کے سب نکمے اور ناقص ٹھہرے۔

البتہ کبھی کبھی بعض شخص دنیا میں ایسے بھی ظاہر ہوئے جنہیں خُدا کے کلام میں کامل کہا گیا مثلاً نوح اپنے زمانہ میں راستباز تھا (پیدائش ۶:۹)، داود کا دل کامل ہوا (۱۔ سلاطین ۱۵:۳)، ایوب کامل اور صادق تھا (ایوب ۱:۸)۔ یہ سب لوگ حقیقی کامل نہ تھے، دیندار اور بھلے آدمی تھے۔ اضافی اور مجازی طور پر کامل تھے اور مسیحی لوگ بھی دنیا میں ایسے ہی کامل ہوتے ہیں۔ آخر کو وہ اور ہم سب اپنے کمال کو پہنچیں گے۔ حقیقی کامل صرف یسوع مسیح ہے۔ وہ دنیا میں پیدا ہو کے حکمت میں اور قد میں خدا کے اور انسان کے نزدیک مقبولیت میں ترقی کرتا گیا (لوقا ۲:۵۲)۔ وہی خدا کا اور اسرائیل کا قدوس ہے۔ اللہ کا بے عیب برّہ ہے۔ اس نے خدا کی مرضی پر پورا پورا ایسا عمل کیا کہ خدا کی نگاہ میں اپنے اور خدا کے درمیان کسی دقیقہ (معمولی بات) کے بھی قصور نہ آنے دیا۔ اس نے آدمیوں کے حقوق بھی پورے کیے بلکہ اپنے جائز حقوق بھی چھوڑ کے آدمیوں کے لئے بے حد فضل تیار کر دیا۔ اسی لئے تمام اولین اور آخرین کی نگاہ اس پر ہے۔ اولین بہ ہدایت الٰہی اُدھر سے اور ہم آخرین اِدھر سے اُسی کو تکتے ہیں اور وہ سب کی نگاہوں کا نشانہ ہے۔ اور جب ہم اُسے تکتے ہیں تو اس کا عکس ہم پر پڑتا ہے اور ہم سدھرتے اور کامل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہم اپنے کمال کو پہنچیں گے اور تمام نقص ہم میں سے نکل جائیں گے۔ کامل انسان یعنی مسیح کے پورے قد کے اندازے تک پہنچے (افسیوں ۴:۱۳)۔

پس وہ سب لوگ جو کامل مرشد کے طالب ہیں چاہیئے کہ مسیح یسوع کو تاکیں۔ ناقص آدمیوں کی طرف تاکنے سے کیا فائدہ ہے۔ ناقص سے ناقص بنتے ہیں اور کامل سے کامل ہوتے ہیں۔ وہ جو کامل خُدا اور کامل انسان ہے اور اولین و آخرین کی نگاہوں کا نشانہ خُدا سے مقرر ہے اور وہ اندیکھے خُدا کی صورت ہے۔ اُس کا تصور عین خُدا پرستی ہے اور غیر کا تصور جو تصور شیخ کہلاتا ہے بُت پرستی ہے۔ **آدمی جب بُت پرستی کرتے ہیں تو خود مثل بُت**

کے ہو جاتے ہیں اور جب خُدا پر ستی کرتے ہیں تو خُدا کی صورت میں بحال ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہ صرف یسوع مسیح کی طرف تاکنے سے ہوتا ہے اور وہ تاکا جاتا ہے اپنی تواریخ میں جو کتاب انجیل میں مذکور ہے۔

دفعہ ۳۸

انسان کے پیدا کرنے سے خُدا کا کیا مطلب ہے؟

ہر موجود شے کے لئے یہ حکیم لوگ چار علتوں یا سببوں کا ذکر کرتے ہیں۔

اول ''علتِ مادی'' ہے مثلاً تخت کے لئے علت مادی لکڑی ہے جس سے وہ بنا ہے۔ انسان کے لئے علت مادی کیا ہے؟ یہ بتانا مشکل ہے کیونکہ انسانی جسم کے لئے تو ہم جلد کہہ سکتے ہیں کہ اربع عناصر اس کی علت مادی ہیں۔ لیکن اس کی رُوح کا مادہ عناصر نہیں ہیں وہ کوئی عالم بالا کی شے ہے جس کی حقیقت معلوم نہیں ہے۔ پس یہی کہنا پڑتا ہے کہ انسان کا مادہ مرکب ہے، سفلیت اور علویت سے۔

دوم ''علتِ صوری'' ہے یعنی اُس شے کی صورت مثلاً تخت کی خاص صورت جو نظر آتی ہے یہ اُس کی '' علت صوری'' کہلاتی ہے۔ انسان کی بھی جو صورت دیکھتے ہو یہ اُس کی علت صوری ہے۔

سوم ''علتِ فاعلی'' جس سے وہ شے بن گئی مثلاً تخت بن گیا ہے۔ بخار سے انسان کو کس نے بنایا؟ عقل کہتی ہے کہ خُدا نے بنایا۔ تب اس کی علت فاعلی خُدا ہے۔

چہارم ''علتِ غائی'' ہے یعنی اُس شے کی وضع سے جو غرض اور مطلب ہے اس کا نام ''علت غائی'' ہے مثلاً تخت کی علت غائی یہ ہے کہ اُس پر بیٹھیں۔ انسان کی پیدائش سے کیا مطلب ہے؟ خُدا تعالیٰ تو چیزوں کے پیدا کرنے میں کسی غرض اور مطلب کا ہر گز محتاج نہیں ہے۔ تو بھی صاف دیکھتے ہو کہ چیزیں موجود ہیں اور اُن کی پیدائش سے جو غرضیں ہیں وہ ان کو چسپاں ہیں، بے غرضی کوئی چیز ہی نہیں۔ ہم نہیں کہتے کہ خُدا ان چیزوں کا محتاج تھا اس لئے بنایا۔ اُس نے اپنی خوشی سے انسان کو پیدا کیا اور سب کچھ اُس کے فائدہ کے لئے بنایا ہے۔

حجت اس میں ہے کہ انسان کو کیوں پیدا کیا؟ اُس کی علت غائی کیا ہے؟ یہ تو ظاہر ہے کہ سب کچھ انسان کے لئے پیدا ہوا پھر انسان کس مطلب کے لئے پیدا ہوا؟ وہ بہت ہی بڑا اور بھاری مطلب ہو گا۔ کرہ ارضی کی پیدائش اور جو کچھ اُس میں ہے ضرور انسان کے لئے ہے۔ ہر انسان کی پیدائش جس مطلب پر ہو گی وہ مطلب سب مطلبوں کے اوپر ہو گا جس کے لئے اتنا بڑا کارخانہ قائم کیا گیا ہے۔ بھائیو! اُس مطلب کو دریافت کرو اور اُس میں قائم ہو تاکہ تمہاری پیدائش کا مطلب تم میں پایا جائے۔

محمد صاحب نے اپنی حدیث میں یہ بتایا ہے شاید کسی رہبان سے اُنہوں نے سُنا ہوگا کہ (**کنت کنزاً مخفیاً فأحببت أن أُعرف فخلقتُ الخلق**) گویا خُدا کہتا ہے کہ " میں پوشیدہ خزانہ تھا میں نے چاہا کہ ظاہر ہو جاؤں پس میں نے جہان کو پیدا کر دیا"۔ قرآن میں محمد صاحب نے کہا ہے کہ آدم کو خُدا نے اس لئے پیدا کیا کہ اپنا خلیفہ یا نائب دنیا میں بنائے۔

ہمہ اُوست والے کہتے ہیں کہ خود اس ساری پیدائش میں جلوہ گر ہے۔ تب اپنا تماشا آپ ہی دیکھ رہا ہے، آپ ہی مادہ ہے، آپ ہی صورت ہے ،آپ ہی فاعل ہے، آپ ہی غایت ہے۔ یہ خیال احمق بھنگڑوں کا ہے نہ اُس کے لئے کوئی دلیل، نہ حجت۔

یہ ایسی بات ہے جسے ایک غم زدہ شاعر نے اپنے دل کا بخار نکالنے کو کہا ہے کہ

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

اور اُن عقلمندوں میں سے بھی جس کے خیال میں جو کچھ آتا ہے وہ کہتا ہے۔ لیکن نفس پرور اور پیٹو لوگ اپنے کاموں سے ظاہر کرتے ہیں کہ گویا وہ اپنی نفسانی خواہشوں کے پورا کرنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کھاؤ، پیو کہ کل مریں گے۔ ہماری عقل نہ تو یہ بات مانتی ہے کہ یہ سب خُدا ہی خُدا ہے اور نہ یہ کہ ہم دکھوں کے لئے پیدا ہوئے ہیں، نہ یہ کہ شکم پروری اور عیاشی ہماری علت غائی ہے۔ کیونکہ اتنا بڑا کارخانہ اور انسان کی یہ عجیب پیدائش اور صورت کسی ذلیل مقصد پر تو ہرگز نہیں ہے۔

اولاً کلام اللہ کی طرف دیکھو کہ انسان کی پیدائش سے وہاں خُدا کا کیا مطلب مذکور ہے؟ (پیدائش باب ۱۔ ۲) ظاہر ہے کہ آدم کو خُدا نے اپنا ہم شکل اس لئے پیدا کیا تھا کہ وہ سب چیزوں پر حاکم اور صرف خُدا کا محکوم ہو کے ابد تک زندہ آرام میں رہے۔ لیکن اس نے باختیار خود اس غرض کو برباد کر دیا، اپنی صورت بھی بگاڑی اور اپنی حکومت بھی کھوئی اور خُدا کا محکوم نہ رہ کے اپنے اوپر موت بھی لی۔ کیونکہ خُدا کا نافرمان موت کا مستحق ہے۔

ثانیاً اُس کامل انسان یعنی یسوع مسیح کی طرف دیکھو جو دنیا میں یگانہ ظاہر ہوا۔ اُس کی تواریخ ثابت کرتی ہے کہ وہ بیشک نادیدہ خُدا کی صورت تھا اور سب چیزوں پر اُس کی حکومت بھی تھی۔ وہ بااختیار خود ہوا اور دریا، ارواح مردم، شاطین، امراض اور موت وحیات وغیرہ سب چیزوں پر حاکم تھا اور خُدا تعالیٰ کا بھی بے قصور، محکوم اور تابع فرمان رہا۔ اس پر موت کا فتویٰ نہ تھا کیونکہ وہ بے گناہ تھا تو بھی اُس نے ہمارے لئے موت کو اپنے اوپر آنے دیا مر گیا، دفن ہوا، تیسرے دن مردوں میں سے جی اُٹھا اور ابد تک زندہ ہے اور خُدا تعالیٰ کے عرش مجید پر تخت نشین ہے۔ اُس کے سارے کام جو ہمارے لئے ہوئے، اُس کی تمام تعلیم جو اُس نے ہمیں دی، اس کی رُوح کی تاثیریں جو ہم پر ہوتی ہیں یہ سب کچھ اسی ایک مطلب پر ہے کہ ہمیں موت میں سے نکالے اور پاک صاف کر کے اور خُدا کا ہمشکل بنا کے صرف خُدا کا محکوم اور سب چیزوں پر حاکم ٹھہرادے تاکہ ہم ابد تک آرام میں زندہ رہیں اور کہ خُدا ہم میں سکونت کرے۔

پس انسان کی پیدائش سے مطلب اور مقصد اور علت غائی یہی ہے کہ انسان ایسا ہو اور ایسے کام کرے تب وہ خُدا کا نائب بجائے خویش (قرابتی) ہو سکتا ہے۔ یہ کیسی عمدہ اور اعلیٰ اور افضل غرض انسان کی پیدائش سے ہے جو ٹھیک اس عظیم دائرہ پیدائش کے مناسب اور ہماری علت مادی اور صوری اور فاعلی کے بھی موافق ہے۔ ایسی علت غائی کا اظہار کبھی کسی دانشمند کی دانائی سے ہوا تھا، ہرگز نہیں اور نہ ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی آدمی اس غلت غائی کو

قبول نہ کرے اور کچھ علت غائی سنائے اُس کا بیان اس بیان سے کچھ نیچے ہی گرا ہوا ہو گا۔ کاش کے ہر کوئی اپنی اس علت غائی سے آگاہ ہو جائے اور اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے یسوع مسیح کے پاس چلا آئے کہ وہ اس کو بحال کریگا اور وہ مقصد حاصل کرا دے گا۔

ف۔ یہ سچ ہے کہ خُدا کسی غرض کا محتاج نہیں تو بھی تمام کارخانہ پیدائش میں ہر شے کے لئے کچھ علت غائی ہے۔ اس سے اُس کی خُدائی محتاج باغراض نہیں ہو جاتی بلکہ اس کی محبت اور قدرت اور حکمت وغیرہ صفات کا اظہار اور بیان ہوتا ہے۔

ف۔ وہ غرض جو انسان کی پیدائش سے ہے ہر فرد بشر میں ہر گز پوری نہ ہو گی کیونکہ وہ جبری غرض نہیں ہے بلکہ آزادی کے ساتھ آدمیوں میں مطلوب ہے صرف اُن کے فائدہ کے لئے۔ اگر آدمیوں میں سے کوئی شخص خود اُس غرض سے الگ ہونا پسند کرے تو اُس کا اختیار ہے اور اسی لئے لکھا ہے کہ بنی آدم میں سے ایک بقیہ نجات پائیگا۔

ف۔ وہ غرض جو ہماری پیدائش سے ہم میں مطلوب ہے اور جس سے ہم سب آدمی بہت ہی دور جا پڑے ہیں جس میں آدمیوں کو پھر بحال کرنے کے لئے یسوع مسیح خُداوند دنیا میں آیا ہے، اسی زندگی کے درمیان عیسایوں میں مکمل نہیں ہوتی ہے۔ ہاں ہمارے اندر بوسیلہ مسیحی ایمان کے وہ غرض کچھ جلوہ گر اور موثر ہوتی ہے اور اس کا بیعانہ ساہم میں آجاتا ہے جس سے یقین ہوتا ہے کہ آئندہ جہان میں وہ غرض ہم میں خُدا تعالیٰ پوری کریگا۔ تمام ایماندار اور معتبر مقدس اسی امید میں دنیا سے چلے گئے کہ ہم آئندہ وقت میں اس غرض کو حاصل کریں گے۔ دیکھو کیا لکھا ہے "پر میں صداقت میں تیرا دیدار حاصل کروں گا۔ میں جب جاگوں گا تو تیری شباہت سے سیر ہوں گا" (زبور ۱۷: ۱۵)۔

ف۔ مسیح خُداوند بااعتبار الوہیت خُدا باپ کے برابر ہے اور بااعتبار انسانیت وہ خُدا تعالیٰ کا پورا خلیفہ اور زمین و آسمان کا پورا اختیار اُس کے ہاتھ میں ہے۔ ہم سب عیسائی بوسیلہ ایمان کے اُس سے اولاً گناہوں کی معافی حاصل کرتے ہیں۔ پھر ہم آپ کو مع اپنی سب خواہشوں کے اُس کا مطیع کر کے قُدوسیت کے رتبہ میں بتدریج ترقی کرتے اور خُدا کی صورت بنتے چلے جاتے ہیں اور تکمیل ہماری اُس صورت میں اُس وقت ہو گی جبکہ ہم قیامت کے فرزند ہو کے پھر نئے بدن میں مسیح سے اُٹھائے جائینگے۔ اس وقت ہم سب اُس کی مانند ہوں گے اور ہماری بحالی کامل ہو گی۔

ف۔ اس مطلب کے لئے ایک خاص دن خُدا سے مقرر ہے۔ اُسی دن کا نام "خُدا کے فرزندوں کے ظاہر ہونے کا دن" ہے۔ اُس دن وہ غرض ہم میں بوسیلہ مسیح کے پوری ہو گی اور ہم ابد تک اس جلال میں رہیں گے۔ اس وقت دنیا میں اُس غرض کی تیاری بوسیلہ مسیح کے رُوح سے ہم ہو رہی ہے اور کچھ ایسا کام ہم میں خُدا سے ہو رہا ہے جس سے ہمیں یقین ہے کہ تکملہ اس کام کا ہم میں اُس غرض کو ضرور پورا کریگا۔ اُس وقت مسیح کے سب مخالف خوار اور رسوا ہونگے اور شیطان کے ساتھ جس کے وہ دنیا میں ساتھی تھے ابدی دُکھ میں چلے جائیں گے۔ زیادہ حسرت اُنہیں اس بات پر ہو گی کہ خُدا کی طرف سے اُن کی بحالی کا انتظام مسیح ہوا اور وہ بلائے بھی گئے مگر از خود نہ آ کے اُنہوں نے اپنی بہتری کا موقع کھو دیا۔

دفعہ ۳۹

موت کے بیان میں

کسی حیوان کی زندگی کا جاتا رہنا" موت" کہلاتا ہے۔انسان کے سوا سب حیوان مطلق فانی ہیں۔پس اُن کی موت یہ ہے کہ اُن کی زندگی بالکل معدوم ہو جائے یعنی بدن ٹوٹ کے عناصر میں مل جائے اور جان بھی کہیں نہ رہے، بالکل نیست نابود ہو جائے۔انسان کی موت کچھ اور چیز ہے۔اس لئے کہ وہ محض حیوان نہیں ہے بلکہ اُس کی حیوانیت کے اُوپر کچھ اور چیز اُس میں ہے جو غیر فانی ہے۔پس جہاں تک انسان میں حیوانیت ہے وہاں تک اُس کے ساتھ بھی وہی معاملہ ہوتا ہے جو سب حیوانوں کے ساتھ موت میں ہوا کرتا ہے لیکن اُس چیز میں جو حیوانیت سے بلند اس میں ہے نیستی کا معاملہ عمل میں نہیں آتا ہے صرف اخراج کا معاملہ ہوتا ہے۔اسی واسطے انسان کی موت کے لئے ایک دوسرا لفظ "انتقال" دنیا میں مروج ہوا ہے۔کلام اللہ میں پانچ لفظ انسان کی موت کے لئے استعمال میں آئے ہیں جن سے کچھ کچھ موت کی کیفیت معلوم ہو جاتی ہے۔

۱۔بدن سے رُوح کا نکلنا (ایوب ۱۱:۲۰)اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رُوح انسانی اُس کے مردہ بدن ہی میں تحلیل نہیں ہو جاتی مگر اُس سے الگ ہو جاتی ہے۔

۲۔رُوح کا انڈیلا جانا جیسے پانی ایک برتن سے دوسرے برتن میں اُنڈیلتے ہیں (یسعیاہ ۵۳: ۱۲)۔اس لفظ میں اشارہ ہے کہ رُوح انسانی بدن سے نکل کے کوئی اور بدن اللہ سے پاتی ہے (۱۔کرنتھیوں ۱۵:۳۵۔۴۴)۔

۳۔چلا جانا یعنی اس جہان کو مع بدن کے چھوڑ کے کسی دوسرے جہاں میں چلا جانا (زبور ۳۹:۱۳)۔

۴۔سو جانا یا موت کی نیند میں آجانا یا خواب دائمی میں چلے جانا (یوحنا ۱۱:۱۱؛ زبور ۱۳:۳؛ یرمیاہ ۵۱:۳۹) ۔یہ الفاظ بدن کی نسبت معلوم ہوتے ہیں کیونکہ رُوح کبھی نہیں سوتی۔دنیا میں دیکھتے ہیں کہ نیند کے وقت بدن سوتا ہے رُوح بیدار رہتی ہے۔ہاں اعضا کو کچھ حواس کے کاموں سے معطل کر کے چپ چاپ ہو جاتی ہے۔

۵۔سورج کا ڈوبنا یا غروب ہونا۔یرمیاہ ۱۵:۹ میں لکھا ہے " اُس کا سورج ڈوب گیا"۔یہاں "رُوح" کو "سورج" کہا گیا ہے اور دنیا کا سورج جب ڈوبتا ہے تو وہ معدوم نہیں ہو جاتا لیکن زمین کی دوسری طرف چلا جاتا ہے۔

ف۔ کلام اللہ سے اور عقل سے بھی موت کی دو قسمیں بلحاظ شخص مردہ کے معلوم ہوتی ہیں۔

اول صادقوں کی موت ہے، دوم بے ایمانوں کی موت ہے۔ صادقوں کی موت یہ ہے کہ انسان ایمان میں مغفرت حاصل کر کے مرے۔ بلعام نے بھی اس موت کی تمنا کی تھی مگر نہ پائی (گنتی ۲۳: ۱۰)۔ اس دنیاوی زندگی کے انجام پر بھی موت انسان کے لئے فتح یابی کا پہلا دروازہ ہے۔ بے ایمانوں کی موت کیا ہے؟ یہ کہ آدمی اپنے گناہوں میں لپٹا ہوا بغیر ایمان اور مغفرت کے مر جائے (یوحنا ۸: ۲۴)۔ یہ موت جہنم میں داخل ہونے کا پہلا دروازہ ہے۔

ف۔ موت کے ظاہری اسباب پر نگاہ کر کے حکیموں نے اُس کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ اول "موت طبعی" وہ ہے کہ جسم کے فطری انتظام میں کچھ خلل آجائے یا وہ شخص اپنی پوری عمر کو پہنچ کے مر جائے جیسے درختوں کے پکے پھل گر جاتے ہیں۔ دوم "موت اختراعی" وہ ہے کہ بھلے چنگے آدمی کی موت کسی اَور سبب سے آجائے مثلاً میں وہ دشمنوں سے یا حاکم سے قتل کیا جائے یا ڈوب مرے یا آگ میں جل جائے یا کوئی اور ناگہانی صدمہ سے مر جائے۔ خیر کسی طرح مر جائے مگر بغیر اجازت اللہ کے کوئی نہیں مرتا۔ مسیح خُداوند فرماتا ہے کہ کوئی چڑیا بھی بے اجازت اللہ کے زمین پر نہیں گرتی۔

ف۔ موت کا وجود انسان کی پیدائش سے پہلے معلوم ہوتا ہے۔ علم ترکیب ارضی سے ظاہر کرتے ہیں کہ انسان سے پہلے زمین پر حیوان رہتے تھے اور وہ مرتے بھی تھے۔ تب موت کا وجود پہلے سے تھا لیکن آدم کو جب خُدا نے پیدا کیا تو اپنی شکل پر بنایا تھا۔ اُس کے لئے موت نہ تھی اور اُس سے کہا گیا تھا کہ اُس درخت سے نہ کھانا ورنہ تو مرے گا۔ پس اگر وہ نہ کھاتا تو ہرگز نہ مرتا اور ہمیشہ زندہ رہتا اور اولاد بھی نہ مرتی۔ موت اُس کے لئے امر طبعی نہ تھا جیسے حیوانات اور نباتات کے لئے امر طبعی ہے۔ لیکن آدم نے نافرمانی کر کے اپنے اوپر موت کا تسلط ہونے دیا اور یوں موت اُس کو لاحق ہو گئی اور ایسی لاحق ہوئی کہ گویا اُس کے لئے امر طبعی ہے، اُس وقت تک کہ سب کچھ نیا ہو نئی زمین، نیا آسمان اور نیا بدن ظاہر ہو۔ ابھی تمام حقیقی عیسایوں کی رُوحوں میں اور اُن کے دلوں میں نوزادگی ظاہر ہوئی ہے تو بھی وہ سب موت کے بدن میں رہتے ہیں یعنی اُس بدن میں جس پر موت کا فتویٰ ہے اور جس کے لئے یہ موت ایک امر طبعی ہو گیا ہے۔ وقت چلا آتا ہے کہ ہم موت کے بدن سے بھی مخلصی پائینگے بوسیلہ مسیح کے۔

ف۔ خُدا کا کلام موت کی دو قسمیں دکھاتا ہے "جسمانی موت" جس کا بیان ہو چکا۔ "روحانی موت" جس کا یہ بیان ہے کہ انسان کی رُوح میں موت کا زہر چھوڑا جائے اور اس پر موت چھا جائے۔ چنانچہ جس وقت آدم نے گناہ کیا تھا روحانی موت سے وہ اُسی وقت گیا تھا۔ جسمانی موت ۹۳۰ برس بعد آئی تھی اور اس عرصہ میں وہ جسمانی زندہ اور روحانی مردہ رہا تھا جب تک کہ بوسیلہ مسیحی ایمان کے موت اُس کی رُوح پر سے نہ ہٹی، وہ روحانی مردہ تھا کیونکہ فتویٰ موت کا اُس پر آگیا تھا اور نسبت الٰہی ٹوٹ گئی تھی اور خُدا کی حضوری سے نکالا گیا تھا۔ اس لئے برکت الٰہی کی اَوس اس پر گرنی

موقوف ہوگئی تھی اور رُوح میں تاریکی چھاگئی تھی اور مزاج میں جسمانیت غالب آگئی تھی اور یہی روحانی موت ہے۔ پولس رسول کہتا ہے کہ ''جسمانی نیت موت ہے'' (رومیوں ۸:۶)۔ یہی بڑی موت ہے اور یہ سب آدمیوں کی رُوحوں میں ہے۔ اگر یہ موت آدمیوں کی رُوحوں میں سے اسی زندگی کے دوران نکل نہ جائے تو اُن شخصوں کو ابدالآباد موت میں رہنا ہوگا۔ جہاں خُدا سے جدائی اور شیطان سے قربت ہے، رات دن رونا اور دانت پیسنا ہے۔ صرف مسیح خُداوند ہے جو اس موت سے آدمیوں کی رُوحوں کو چھڑاتا ہے اور بدنوں کو مرنے دیتا ہے کیونکہ نئے بدن ان لوگوں کو ملنے والے ہیں۔

ف۔ مسیح پر موت کا فتویٰ نہ تھا۔ وہ ہمارے لئے مُوا کہ موت کے فتوے کو مکمل کر کے ہم پر سے ہٹائے۔ دیکھو کیا لکھا ہے '' کوئی اُسے (یعنی میری جان کو) مجھ سے چھینتا نہیں بلکہ میں اُسے آپ ہی دیتا ہوں۔ مجھے اُس کے دینے کا بھی اختیار ہے اور اُسے پھر لینے کا بھی اختیار ہے۔ یہ حکم میرے باپ سے مجھے ملا'' (یوحنا ۱۰۔۱۸)۔ مسیح خُداوند جو کامل انسان اور محض بے گناہ شخص تھا اُس پر موت کا فتویٰ نہ تھا کیونکہ موت گنہگار کے لئے ہے اور وہ بے گناہ تھا اس لئے اُس کا حصہ موت میں نہ تھا۔ اُس نے اپنی مرضی اور خوشی سے ہمارے فائدہ کے لئے اپنی جان دی اور پھر اپنی جان کو لے لیا۔ اگر مسیح پر بھی موت کا فتویٰ ہوتا جیسے سب آدمیوں پر ہے تو وہ ہمارے گناہوں کا کفارہ نہ ہو سکتا۔ ہمارے قرض وہی شخص ادا کر سکتا ہے جو خود قرضدار نہیں ہے جو خود قرضدار ہے وہ اپنا قرض ادا نہیں کر سکتا ہمارے قرض کیسے ادا کرے گا؟ پس مسیح خُداوند موت کا مطلق قرضدار نہ تھا اور اسی لئے اُس نے آیت بالا میں صاف بتایا ہے کہ میں اپنی جان پر اختیار رکھتا ہوں مروں یا نہ مروں۔ خُدا باپ کی مرضی تو یہ ہے کہ میں اپنی جان کفارہ میں دوں مگر جبر نہیں ہے۔ مجھے اختیار دیا گیا ہے۔ سو میں اپنے باپ کی مرضی کو اپنے اختیار سے قبول کرتا ہوں اور جان دیتا ہوں اور پھر اپنی جان کو موت کے نیچے سے نکال کے آپ لے لوں گا۔

(۱۔ پطرس ۳: ۱۸) راستباز نے ناراستوں کے لئے دکھ اُٹھایا۔ (۱۔ کرنتھیوں ۱۵: ۵۴) موت کو فتح نے نگل لیا۔ (یسعیاہ ۲۵: ۸) وہ موت کو ہمیشہ کے لئے نابود کرے گا۔ آدم کے سبب سے آدمیوں میں موت آئی ہے مسیح کے سبب سے موت دفع ہوئی اور زندگی آئی اور ساری بحالی کی صورت دکھائی دی۔ فی الحال موت جہان میں نظر آتی ہے لیکن اس کی جڑیں کٹ گئی ہیں اور ایک وقت چلا آتا ہے کہ یہ موت، غم، رونا اور آہ و نالہ مطلق اس جہان سے دفع ہو جائے گا۔ سارے بے ایمان لوگ اور یہ سب آفتیں ہٹ جائیں گی اور سب کچھ نیا اور نہایت خوب اور پُر جلال ہوگا۔

ف۔ موت کی چابی مسیح یسوع خُداوند کے پاس ہے '' ۔۔۔ میں مر گیا تھا اور دیکھ ابدالآباد زندہ رہوں گا اور موت اور عالم ارواح کی کنجیاں میرے پاس ہیں'' (مکاشفہ ۱:۱۸)۔ موت سے رہائی بخشنا یہوواہ خُداوند ہی کا کام ہے (زبور ۶۸: ۲۰)۔ مسیح خُداوند '' یہواہ'' ہے اس لئے موت کی چابیاں اُس کے پاس ہیں اور اس لئے بھی کہ وہ موت پر غالب آیا۔ اُس کا سارا زور اُس نے سہا۔ اُس کا تمام زہر نوش کر لیا۔ اپنے آپ کو اس کے قبضہ میں کر دیا اور اس کی ساری کیفیت کا لطف دیکھ کے اُس کے نیچے سے از خود نکل آیا اور قیامت اپنی آپ کر لی اور مردوں میں سے پہلوٹھا ہو کے جی اُٹھا اور خُدا تعالیٰ کی دہنی طرف اُس کے عرش مجید پر جا بیٹھا۔ اب وہ سب اولین اور آخرین کو موت کے قبضہ سے نکال کے زندہ کرے گا اور اُن کے بدنوں میں اُنہیں کھڑا کرے گا اور اپنے سب بندوں کو اپنے ساتھ جلال میں اور حقیقی خوشی و آرام میں لائے گا اور سب شیطان کے فرزندوں کو اور اُن سب آدمیوں کو جو عیسائی ہو کے نہیں مرتے تھے، ابدی موت کے حوالہ کر دے گا کہ ہمیشہ دیکھ میں رہیں۔

دفعہ ۴۰

تعلقات ارواح مومنین باخُداوند یسوع مسیح

مومنین کو بوسیلہ ایمان اور برگزیدگی کے خُداوند مسیح کے ساتھ ایک خاص علاقہ حاصل ہو جاتا ہے جس کے سبب سے وہ لوگ مسیح میں پیوند ہو کے خُدا کے متبنیٰ فرزند ہو جاتے ہیں اور الٰہی میراث میں شریک ہوتے ہیں۔اسی علاقہ کے سبب سے مسیحی برکتیں ان میں آجاتی ہیں اور ان کی کمزوریاں اور خطائیں دفع ہوتی ہیں۔"تم سب جتنوں نے مسیح میں شامل ہونے کا بپتسمہ لیا مسیح کو پہن لیا"(گلیتوں ۳:۲۷)۔" اور نئی انسانیت کو پہنو جو خُدا کے مطابق سچائی کی راست بازی اور پاکیزگی میں پیدا کی گئی ہے"(افسیوں ۴:۲۴)۔"اور نئی انسانیت کو پہن لیا ہے جو معرفت حاصل کرنے کے لئے اپنے خالق کی صورت پر نئی بنتی جاتی ہے"(کلسیوں ۳:۱۰)۔"کیونکہ ہم جیتے جی یسوع کی خاطر ہمیشہ موت کے حوالہ کئے جاتے ہیں تاکہ یسوع کی زندگی بھی ہمارے فانی جسم میں ظاہر ہو"(۲۔کرنتھیوں ۴:۱۱)۔"اور تم بھی اُس میں باہم تعمیر کیے جاتے ہو تاکہ رُوح میں خُدا کا مسکن بنو"(افسیوں ۲:۲۲) ۔"پس اے بھائیو! چونکہ ہمیں یسوع کے خون کے سبب سے اُس نئی اور زندہ راہ سے پاک مکان میں داخل ہونے کی دلیری ہے۔جو اُس نے پردہ یعنی اپنے جسم میں سے ہو کر ہمارے واسطے مخصوص کی ہے"(عبرانیوں ۱۰:۱۹،۲۰)۔"غرض ہماری خاطر جمع ہے اور ہم کو بدن کے وطن سے جدا ہو کر خداوند کے وطن میں رہنا زیادہ زیادہ منظور ہے"(۲۔کرنتھیوں ۵:۸)۔اسی طرح کے اَور بہت سے مقام کلام اللہ میں ہیں جنہیں ناظرین خود دیکھ سکتے ہیں۔ حاصل کلام یہ ہے کہ سچے مومنین کی ارواح میں درمیان اسی دنیا کے بعلاقہ ایمان برکاتِ ذیل نمودار ہوتی ہیں۔نئی پیدائش، نئی زندگی، نئی انسانیت خُدا کی صورت پر بنتی چلی جاتی ہے اور دل خُدا کا گھر ہوتا ہے۔ مسیح کی موت اور زندگی کی تاثیر سے گناہ کی نسبت مردہ اور راستبازی میں زندہ ہوتے ہیں اور لائق قربت اور حضوری کے ہوتے ہیں۔یہ سب کچھ مسیح کی رُوح سے اور اُس کے کفارہ کی تاثیر سے ان میں ہوتا ہے۔

ف۔ اس میں کچھ شک وشبہ نہیں ہے کہ ضرور ایسا ہوتا ہے۔تواریخ کلیسیا سے ظاہر ہے کہ ہزار ہا ہزار آدمیوں کی رُوحوں میں ایسی تاثیریں ہوئی ہیں اور ہر زمانہ میں خاص بندگانِ مسیح خُدا کے گواہ ایسی تاثیروں سے بھرپور پائے جاتے ہیں۔اب بھی موجود ہیں اور آئندہ کو بھی ملیں گے۔اگر کوئی چاہے کہ ایسے لوگوں کو دیکھے تو حقیقی مسیحیوں کے ساتھ رفاقت اور دوستی پیدا کر کے وہ دریافت کر سکتا ہے کہ ایسی تاثیریں مسیح سے اُس کے مومنین کی ارواح میں فی الحقیقت موجود ہیں اور وہ کچھ بات نہیں ہے جو بعض مخالف بیٹھے ہوئے تعصب کی راہ سے حق کے خلاف ایسی تاثیروں کا انکار کرتے ہیں۔ ہمیں ایسے آدمی کلیسیا میں کہیں کہیں صاف نظر آتے ہیں اور ہم اپنے اندر بھی ایسی پاک تاثیریں مسیح کی طرف سے دیکھتے ہیں اور صاف کہتے ہیں کہ کلام اللہ کا بیان حق ہے۔

یہ سب پاک تاثیریں اور تبدیلیاں جو مسیح سے مومنین میں ہوئی ہیں یہ سب مسیح کی رُوح سے ہیں جو اُن میں موثر ہے۔اور جب کہ یہ بات ثابت ہے کہ مسیح کی رُوح نے اُن میں موثر ہو کے اُنہیں کیا سے کچھ کر دیا تو ہم کیونکر قبول نہ کریں کہ آئندہ کو اُسی کی رُوح سے ان میں کیا کچھ نہ ہو گا۔جس رُوح سے ہماری رُوحوں میں فی الحال زندگی آئی ہے،اُسی رُوح سے ہمارے بدنوں کی قیامت بھی جلال کے لئے ہو گی۔"اور اگر اُسی کا رُوح تم میں بسا ہوا

ہے جس نے یسوع کو مردوں میں سے جلایا تو جس نے مسیح یسوع کو مردوں جلایا وہ تمہارے فانی بدنوں کو بھی اپنے اُس رُوح کے وسیلہ سے زندہ کرے گا جو تم میں بسا ہوا ہے"(رومیوں ۸: ۱۱)۔ یہ ایک دم میں، ایک پل میں، پچھلا نرسنگا پھونکتے وقت ہوگا (ا۔کرنتھیوں ۱۵: ۵۲) اور جو مسیح میں ہو کے موئے ہیں وہ پہلے جی اُٹھینگے (ا۔تھسلنیکیوں ۴: ۱۶)۔ مسیح خداوند "اپنی اس قوت کی تاثیر سے۔۔۔ ہماری پست حالی کے بدن کی شکل بدل کر اپنے جلال کے بدن کی صورت پر بنائے گا"(فلپیوں ۳: ۲۱)۔ یوحنا رسول بیان کرتا ہے کہ ہم اُس کی مانند ہوں گے (ا۔یوحنا ۳: ۲)، جہاں مسیح ہے وہاں ہونگے اور اُس کا جلال دیکھیں گے (یوحنا ۱۷: ۲۴)۔

ف۔ اگر تم نے اس دنیا میں عیسائی ہو کے مسیح کی رُوح پائی ہے اور وہ روح تم میں اب موثر ہے اور تمہیں وہ رُوح خُدا کی رفاقت کا لطف اب دکھا رہی ہے تو یقین کرو کہ اسی رُوح سے تمہارے بدنوں کی قیامت بھی جلال کے لئے ہوگی۔ اور اگر رُوح نہیں پائی تو قیامت تو ہوگی مگر رسوائی اور ذلت اور ابدی دکھ کے لئے۔

اگرچہ بعد موت رُوح اور بدن میں جدائی ہو جاتی ہے۔ رُوح بدن سے نکل کے یا ابرہام کے پاس یا شیطان کے فرزندوں کے جھنڈ میں چلی جاتی ہے اور بدن خاک میں مل جاتا ہے۔ تو بھی کلام اللہ کے بعض مقاموں سے ثابت ہے کہ رُوحوں کو اپنے بدنوں سے ایک اضافی علاقہ باقی رہتا ہے اور آخر کو رُوح اپنے ہی بدن میں آئے گی۔ ہاں ایماندار کا بدن جلال میں اور بے ایمان کا بدن ذلت میں اُٹھے گا تو بھی وہی بدن ہوگا اور وہی صورت اُس شخص کی ہوگی جو پہلے تھی۔ جلال میں صورت سابقہ نمایاں ہوگی اور ذلت میں وہی پہلی صورت دکھائی دے گی جس سے وہ پہچانا جائیگا کہ فلاں شخص ہے۔ پس جسم اور رُوح کے علاقہ کو موت معدوم نہیں کرتی ہے۔ ایوب کہتا ہے میری یہی آنکھیں اُسے دیکھیں گی نہ بیگانہ کی (ایوب ۱۹: ۲۷)۔ (۲۔سلاطین ۱۳: ۲۱) میں دیکھو کیا لکھا ہے کہ جب وہ مردہ الیشع نبی کی قبر میں گرایا گیا اور الیشع کی ہڈیوں سے لگا تو وہ جی اُٹھا اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔

الیشع کی رُوح کو اُس کی مدفون ہڈیوں کے ساتھ علاقہ تھا تب ہی تو یہ ہوا کہ غیر مردہ اُس سے محسوس ہو کے جی اُٹھا۔ اس بات کے ثبوت کے لئے غور کیجیئے۔ اُس لڑکے کی جان اُس میں پھر آئے (ا۔سلاطین ۱۷: ۲۱)، اُن کی لاشوں پر جو مجھ سے باغی ہوئے نظر کریں گے (یسعیاہ ۶۶: ۲۴)، میں اُسے آخری دن میں پھر زندہ کروں گا (یوحنا ۶: ۴۰)، قبریں کھل گئیں اور بہت سے جسم ان مقدسوں کے جو سو گئے تھے جی اٹھے (متی ۲۷: ۵۲)۔ بدن اور رُوح کے درمیان جو اضافی علاقہ ہے اس کا ذکر بہت آیتوں میں ہے۔

دفعہ ۴۱

انسانی رُوح کے لباس کے بیان میں

جبکہ سچے ایماندار عیسائی کی رُوح اُس کے بدن سے نکل جاتی ہے تو خُدا تعالیٰ اُس کو اَور ایک بدن دیتا ہے اور وہ بدن جسمانی نہیں ہے بلکہ نورانی ہے اور ایک لباس بھی رُوح کو عنایت ہوتا ہے جس سے اُس کی برہنگی پوشیدہ ہوتی ہے اور وہ رُوح اُس لباس میں خوبصورت نظر آتی ہے۔ ہم حقیقتاً ملبس ہوں گے نہ کہ ننگے پائے جائیں گے (۲۔ کرنتھیوں ۵:۳)۔ آسمانی جسم بھی ہیں اور زمینی بھی ہیں، آسمانیوں کا جلال اَور ہے اور زمینیوں کا اَور ہے (۱۔ کرنتھیوں ۱۵:۴۰)۔ یہ فانی جسم بقا کو اور غیر فانی کو پہنے گا (آیت ۵۳)، سب مبدل ہو جائیں گے (آیت ۵۱)، ایک عمارت خُدا سے پائیں گے (۲۔ کرنتھیوں ۵:۱)۔ یہ رُوح کے بدن کا ذکر ہے۔ موت کا بدن چھوٹ جائیگا (رومیوں ۷: ۲۴)، جیسا وہ آسمانی ہے ویسے وہ بھی جو آسمانی ہیں (۱۔ کرنتھیوں ۱۵: ۴۸)، جس میں ہو کے (یعنی روحانی بدن میں ہو کے) اُس نے اُن روحوں کے پاس جو قید تھیں جا کے منادی کی (۱۔ پطرس ۳: ۱۹)۔

پھر لکھا ہے کہ وہ جلال میں ظاہر ہوئے یعنی موسیٰ اور ایلیاہ (لوقا ۹:۳۱)۔ جلالی اور غیر فانی بدن کی پوشاک سفید ہو گی (لوقا ۲۴:۴؛ مکاشفہ ۳:۴، ۱۸)۔ خُداوند مسیح کی صورت جب تبدیل ہو گئی تھی تو اُس کا چہرہ آفتاب سا چمکا تھا اور اُس کی پوشاک نور کی مانند سفید ہو گئی تھی (متی ۱۷:۲)۔ سموئیل نبی جب بلایا گیا تو وہ اپنی پرانی وضع کے لباس میں آیا تھا تاکہ ساؤل سے پہچانا جائے (۱۔ سموئیل ۲۸:۱۴)۔ مسیح کی راستبازی تمام مومنین سلف و خلف (**سلف**: آباؤاجداد۔ اگلے زمانے کے لوگ، **خلف**: جانشین، پیچھے آنے والے) کی رُوحوں کا خوبصورت لباس ہے اور یہی شادی کا لباس ہے جو بادشاہ کی طرف سے ہمیں بخشا جاتا ہے۔ چاہیئے کہ اسی دنیا میں ہم اس لباس کو رُوحوں میں پہنیں اور اس لباس کی حفاظت کریں۔ یہ لباس اب بھی خوش نما ہے اور آئندہ کو اس کا جلال خوب ظاہر ہو گا۔ **فقط**

تمت